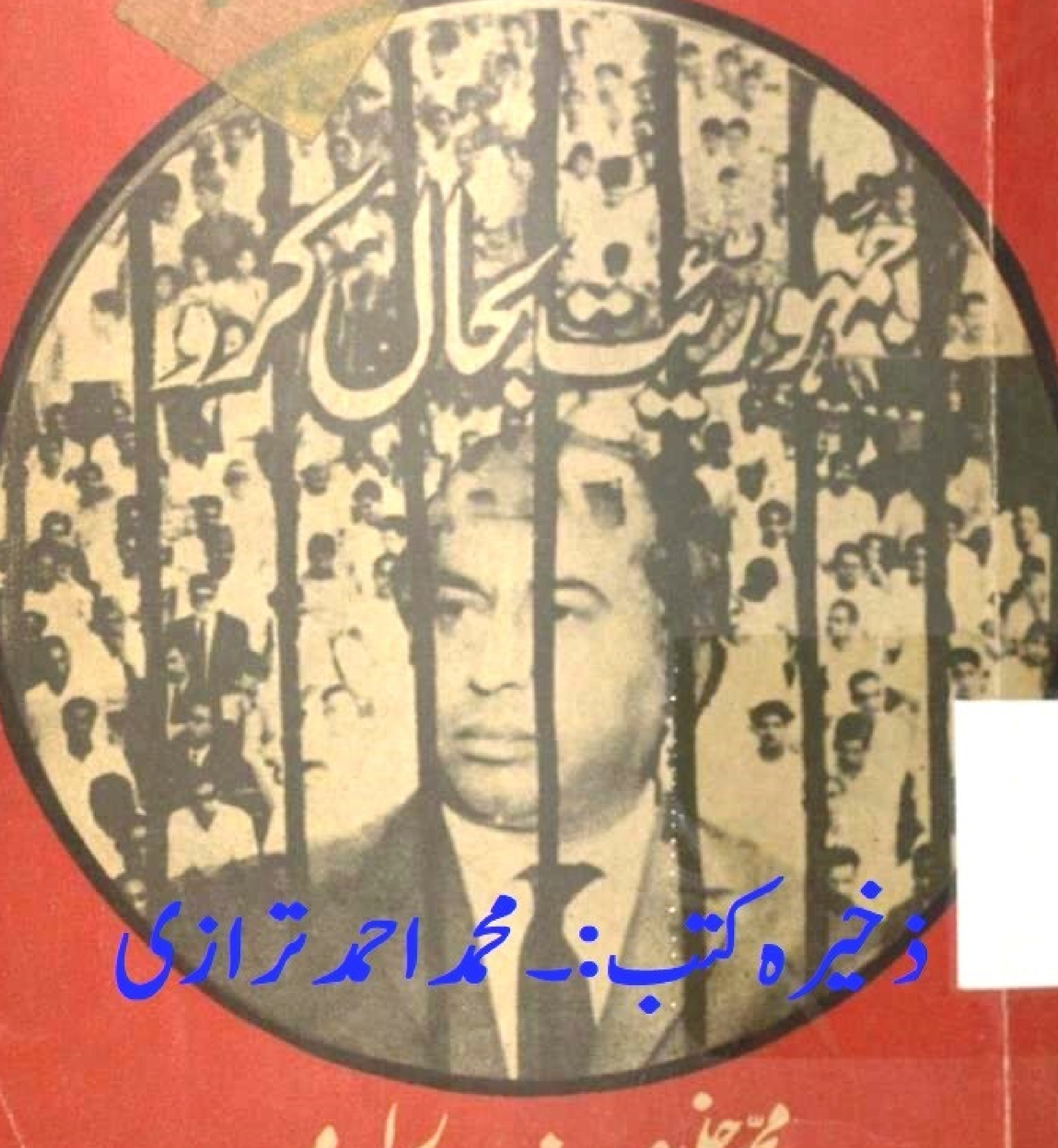
گرفتاری سے قاتلانہ حملے تک

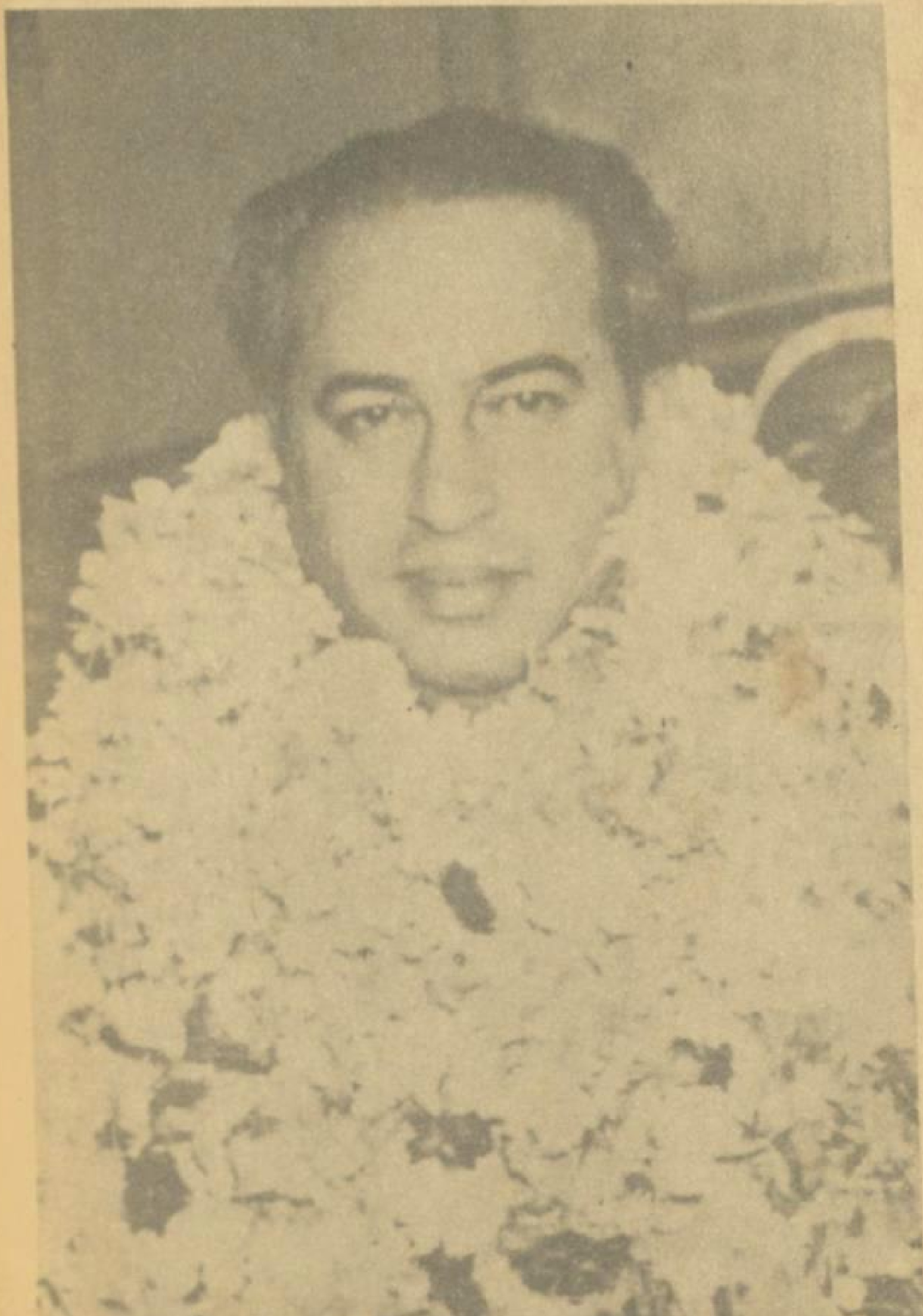
ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے کی مکمل کارروائی



محمد حنیف رامے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گرفتاری سے قاتلانہ حملے تک



محمد حنیف رامے

گرفتاری سے قاتلانہ حملے تک

— بھٹو کیس کی مکمل روداد —

البیان
چوک انارکلی ، لاہور

بار اوّل ——— جون ۱۹۶۹ء
طابع ——— مکتبۂ جدید پریس لاہور
ناشر ——— محمد حنیف رامے



بیگم نصرت بھٹو کے نام

چیئرمین بھٹو کی نظربندی کے دوران بیگم نصرت بھٹو نے مجاہدانہ عزم و استقلال کا جو مظاہرہ کیا وہ ہم سب کے لیے مثال تھا۔ میں یہ کتاب ان کے نام معنون کر کے خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

ترتیب

پیش لفظ

ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کوئی ذاتی نوعیت کا واقعہ نہ تھا۔ یہ واقعہ ہماری عظیم الشان عوامی جدوجہد کے آغاز میں بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ چیئرمین بھٹو نے جس مجاہدانہ انداز میں ایوب خان کی آمریت کو للکارا تھا اور جس طرح آگے بڑھ کر ظلم کی چکی میں پسنے والے عوام کے ترجمان کی حیثیت سے، پہلی قربانی پیش کی تھی وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک ولولہ انگیز باب ہے اور بھٹو کی گرفتاری اور اس کے مقدمے کی روداد اس باب کی روشن پیشانی۔

اس مقدمے کی سماعت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جس خصوصی بنچ نے کی وہ مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین اور مسٹر جسٹس محمد گل پر مشتمل تھا۔ چیئرمین بھٹو کی طرف سے میاں محمود علی قصوری وکلاء کے سربراہ تھے۔ ان کی مدد مسٹر ذکی الدین پال، شیخ محمد رشید، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ، میاں منظر بشیر، مسٹر خورشید حسن میر، میاں عبدالستار نجم، مسٹر خورشید محمود قصوری، مسٹر شیر علی اور صاحبزادہ احمد رضا خان کر رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر، ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل قاضی محمد اختر، اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل مسٹر دلاور محمود، مسٹر اسماعیل بھٹی اور سید فاروق حسین پیروی کرتے رہے۔

اس اہم مقدمے کے دوران ملک کے سیاسی حالات نے کئی کروٹیں لیں اور بالآخر چیئرمین بھٹو نے مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے قبل وہ اپنا یادگار حلفیہ بیان عدالت میں داخل کر چکے تھے جس نے

ایوب حکومت کی ہوا اکھاڑنے میں زبردست حصہ لیا۔

یہ مقدمہ ایک ٹھوس سیاسی عمل تھا اور چیئرمین بھٹو جیل کے اندر بیٹھے ہوئے، نہایت فراست سے اس عمل کے ذریعے ملک کی سیاست پر اثرانداز ہو رہے تھے۔ مقدمے کی کارروائی جہاں ایوب حکومت کو بُری طرح بے نقاب کر رہی تھی وہاں عوامی جدّوجہد کے لیے بھی مہمیز کا کام دے رہی تھی۔ جُوں جُوں مقدمہ آگے بڑھتا گیا، عوامی جدّوجہد بھی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتی گئی۔ چنانچہ ملک میں نافذ شدہ ہنگامی صورت حال کا خاتمہ اور چیئرمین بھٹو کی رہائی جیسے دو الگ الگ واقعات یکجا واقع ہوئے۔

مقدمے کی تیاری میں میاں محمود علی قصوری نے شب و روز ایک کر دیے۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ محمد رشید، ارباب حیات محمد خان، مسٹر خورشید حسن میر، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ، مسٹر غلام مصطفیٰ کھر، مسٹر ممتاز علی بھٹو اور میاں محمد اسلم کے علاوہ بیگم نصرت بھٹو نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا۔

یہ کتاب کچھ جلدی میں مرتب ہوئی ہے۔ اس کی ترتیب میں جن دوستوں نے میری مدد کی ان میں حسین نقی صاحب اور عباس اطہر صاحب خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ اس کتاب کو کہیں زیادہ مستند بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن قانونی دستاویزوں کی نقلوں کے انتظار میں کتاب کی اشاعت کو ملتوی کرنا مناسب نہ تھا۔ جب بھی موقع ہوا یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

محمد حنیف رامے

گرفتاری

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کے اقتصادی اور جمہوری حقوق منوانے کی مہم ستمبر ۱۹۶۸ء میں حیدر آباد سے شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی آواز پورے مغربی پاکستان میں گونجنے لگی۔ وہ اکتوبر کے آواخر اور نومبر کے اوائل میں سابق صوبہ سرحد کا دورہ کرتے ہوئے راولپنڈی پہنچے اور پھر لاہور آ گئے۔ ہر جگہ اُن کا شاندار استقبال ہوا۔ حکومت بھٹو صاحب کی مقبولیت دیکھ کر بوکھلا اٹھی اور انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی رات کو بھٹو صاحب کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گلبرگ میں ڈاکٹر مبشر حسن کی کوٹھی سے گرفتار کر کے میانوالی جیل پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی لاہور اور دوسرے شہروں سے بارہ دیگر لیڈروں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ ان میں مسٹر عبدالولی خاں، مسٹر ممتاز علی بھٹو ایم۔ این۔ اے، مسٹر غلام مصطفےٰ کھر ایم۔ این۔ اے، ارباب سکندر خاں، میر رسول بخش تالپور، ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ ایاز، مسٹر اجمل خٹک، ملک اسلم حیات، ارباب محمد حیات خاں، مسٹر شوکت لودھی، مسٹر امان اللہ خاں اور مسٹر احمد رضا خاں شامل تھے۔

ان گرفتاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک سرکاری ترجمان نے کہا کہ حکومت کو گرفتار شدگان کے متعلق اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایسی کارروائیاں کر رہے ہیں جو پاکستان

کے تحفظ، عوام کی سلامتی، ملکی مفادات، امن عامہ برقرار رکھنے کے قانون اور مغربی پاکستان میں پُرامن صورت حال قائم رکھنے کے منافی تھیں۔

ترجمان نے کہا کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے قاعدہ نمبر ۳۲ کے مطابق جس کے تحت یہ گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں۔ اگر مرکزی حکومت کو کسی شخص کے متعلق یہ یقین ہو جائے کہ وہ ایسی سرگرمیاں کر رہا ہے جو پاکستان کی سلامتی، عوام کے تحفظ، پاکستان کے مفادات اور ملکی دفاع کے منافی ہیں اور جن سے امن عامہ کی برقراری، کسی دوسرے ملک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات، پاکستان کے کسی حصے میں بھی پُرامن صورتِ حال کے قیام روزمرہ کے استعمال کی ضروری اشیا کی فراہمی، ضروری سروسز، پاکستان کی جنگی کارروائیوں یا فوجی اعلانات پر بُرا اثر پڑ رہا ہے اور اُسے ان کارروائیوں سے باز رکھنا ضروری ہے تو مرکزی حکومت اس امر کے احکام جاری کرنے کی مجاز ہو گی کہ اس شخص کو نظر بند کر دیا جائے۔ ایک سوال کے جواب میں ترجمان نے کہا کہ گرفتار شدہ لیڈروں کی نظر بندی کے احکام میں نظر بندی کی مدت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ انہیں تاحکم ثانی نظر بند رکھا جائے گا۔

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے بارے میں ڈاکٹر مبشر حسن بتاتے ہیں — ان کا یہ بیان ہفت روزہ نصرت لاہور کے مقدمہ نمبر (۱) - مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔

رات کو ۱½ بجے کے قریب پولیس نے میری کوٹھی کے گیٹ پر دستک دی۔ اس سے پہلے پولیس کے چالیس پچاس آدمی جو رائفلوں سے مسلح تھے بنگلے کے چاروں طرف گھیرا ڈال چکے تھے۔

ایک پولیس افسر نے چوکیدار سے گیٹ کھولنے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار

کر دیا اور وجہ پوچھی۔ پولیس والے وجہ بتانے کے موڈ میں نہیں تھے انہوں نے زبردستی گیٹ کھول لیا اور اندر آ گئے۔ کچھ پولیس والوں نے چوکیدار کو "وجہ پوچھنے کا مزہ چکھانے" کے لیے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے اُسے رائفلوں کے کندے اور ٹھوکریں ماریں اور پھر برآمدے میں آ گئے۔ میں اپنے بستر میں تھا۔ اچانک دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ جب میں بستر سے نکل کر دروازے کی طرف آ رہا تھا تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ پولیس آ گئی ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک ڈی ایس پی اور کچھ سپاہی زبردستی اندر گھس آئے۔ میں نے اُن سے پوچھا "کیا بات ہے، تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بھٹو صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کچھ دیر ٹھہرو۔ پہلے میں جاکر اُن کو جگاتا ہوں۔ پھر تم اُن کے کمرے میں چلے جانا" میں نے جواب دیا۔

وہ انتظار کرنے کے لیے رضامند ہو گئے۔ میں بھٹو صاحب کے کمرے میں پہنچا، انہیں جگایا اور کہا۔

"اٹھیے! پولیس آپ کو گرفتار کرنے آ گئی ہے۔"

بھٹو صاحب نے کسی حیرت یا تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے یہ خبر ان کے لیے کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ انہوں نے کہا "کوئی بات نہیں، پولیس کو اندر بلا لو۔"

میں پولیس کو بلانے کے لیے واپس آیا تو وہ میرے ٹیلی فون کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ ٹیلی فون کی تاریں کٹ چکی ہیں یا نہیں ریسیور کان سے لگا کر دیکھا، تاریں کٹ چکی تھیں۔ بہر حال اس کے باوجود انہوں نے احتیاطاً ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں ہدایت بھی کی کہ ہم ٹیلیفون

استعمال نہ کریں۔ مزید احتیاط کے طور پر انہوں نے وہاں ایک سپاہی بھی کھڑا کر دیا۔ جیسے تاریں کٹ جانے کے باوجود ٹیلی فون کرنا ممکن ہو۔

میں ڈی ایس پی کو لے کر دوبارہ بھٹو صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ ڈی ایس پی نے بھٹو صاحب سے کہا:

"جناب ہمارے پاس احکامات ہیں۔ یہ بڑا ناخوش گوار کام ہے جو ہم انجام دینے پر مجبور ہیں......"

"آپ تشریف رکھیے"۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا۔

میں نے ڈی ایس پی سے حکم دکھانے کے لیے کہا۔ انہوں نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ بھٹو صاحب نے بھی آرڈرز پڑھے اور کہنے لگے "اچھا میں تیار ہو جاتا ہوں، آپ تھوڑی دیر انتظار کریں"۔

میں پولیس والوں کو گیلری میں لے آیا تاکہ بھٹو صاحب اطمینان سے تیار ہو سکیں۔ اس وقت گھر میں میرے اور بھٹو صاحب کے علاوہ ممتاز علی بھٹو اور پیر بخش بھٹو بھی موجود تھے۔ انہیں بھی پولیس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ جاگ پڑے تھے۔ بہرحال پولیس والے مصطفےٰ کھر کے بارے میں زیادہ فکرمند تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا:

"مصطفےٰ کھر کہاں ہیں؟"

"یہاں نہیں ہیں" میں نے جواب دیا۔

"وہ کہاں ہوں گے"۔ انہوں نے زور دے کر کہا۔

"مجھے کیا معلوم ہے، کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوں گے، تلاش کر لیجیے"۔

"اچھا میر رسول بخش تالپور کہاں ہیں؟"

"وہ بھی یہاں نہیں ہیں اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں ہوں گے"۔

یہ کہہ کر میں بھٹو صاحب کے کمرے میں چلا گیا تاکہ ان کا سامان باندھنے میں مدد دوں۔ گھر میں ایک ہی بستر بند تھا، وہ نکال کر اُن کو دے دیا۔ تقریباً پونے گھنٹے میں بھٹو صاحب کی ضرورت کا سامان بندھ کر تیار ہوا۔ اس دوران میں پولیس والوں کو چائے پینے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بھی چائے پینے سے انکار کر دیا۔

سوا دو بجے کے قریب بھٹو صاحب تیار ہو کر باہر نکلے۔ میں، ممتاز بھٹو اور پیر بخش بھٹو ان کے ساتھ تھے۔ گیٹ کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک شیورلیٹ کار کھڑی تھی۔ ہم نے بھٹو صاحب کا سامان کار میں رکھوایا اور پھر انہیں الوداع کہا۔ وہ دروازہ کھول کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دو پولیس والے ان کے ساتھ بیٹھے۔ ڈرائیور سمیت تین پولیس والے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار روانہ ہو گئی۔ پولیس کی ایک موٹر ان کی کار کے آگے اور دوسری پیچھے لگ گئی۔

جب ہم بھٹو صاحب کو الوداع کہہ کر گیٹ پر پہنچے تو اچانک ایک پولیس افسر نے کہا: "اب آپ حضرات بھی تیار ہو جائیے۔"

ہم نے کہا: "گرفتاری کا حکم دکھائیے۔"

انہوں نے ممتاز بھٹو اور میرے بارے میں احکام دکھا دیئے لیکن پیر بخش بھٹو کے بارے میں کہا کہ ان کے متعلق احکامات تھانے چل کر دکھائیں گے۔ اس پر میں اڑ گیا۔ میں نے کہا "یہ میرے مہمان ہیں اور میں انہیں اس طرح اپنے گھر سے لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔" پولیس والوں نے بڑا اصرار کیا اور کہنے لگے: "ڈاکٹر صاحب ہمارا اعتبار کیجئے۔ ہم تھانے پہنچ کر احکامات دکھا دیں گے۔" (مسٹر پیر بخش بھٹو کو تھانے پہنچ کر چھوڑ دیا گیا)

خیر ہم مان گئے اور اپنا سامان باندھنے لگے۔ تیار ہو کر باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ

گئے۔ موٹر سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ پولیس والوں نے دھکے لگائے تب کہیں جا کر اُس میں حرکت پیدا ہوئی۔

جب گھر میں کوئی مرد نہ رہا تو پولیس والے زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے تو وہ مکان کے دروازے پر گیلری میں کھڑے تھے، ہمارے جاتے ہی انہوں نے ڈرائنگ روم کھلوا لیا اور بڑی بے تکلفی سے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ نوکروں کو چائے بنانے کا حکم دیا اور میری بیوی سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ جب انہوں نے بار بار یہ پوچھا کہ اس گھر میں کوئی اور مرد ہے یا نہیں تو میری بیوی کو بھی غصہ آ گیا اور انہوں نے انہیں خوب جھاڑ پلائی۔ بہرحال پولیس نے انہیں باہر جانے سے روک دیا اور اس طرح صبح سات بجے تک زیرِ حراست رکھا۔ ٹیلی فون کٹ چکا تھا۔ صبح جب میرے دوست حنیف رامے اپنی گاڑی لے کر پہنچے تاکہ بھٹو صاحب اور دوسرے ساتھیوں کو سٹیشن پہنچانے میں مدد دیں تو انہیں رات کے واقعات کا پتا چلا۔ اور پھر اُن سے دوسرے ساتھیوں کو معلومات ملیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں شروع شروع میں جیل کے اندر یہی سمجھتا تھا کہ حنیف صاحب بھی گرفتار ہو گئے ہوں گے۔

رٹ درخواست

چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے خلاف جگہ جگہ احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۱۴ نومبر کو بیگم نصرت بھٹو لاہور پہنچیں اور آئین کی دفعہ ۹۸ کے تحت مغربی پاکستان ہائیکورٹ میں مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے احکام کو چیلنج کر دیا۔ رٹ پٹیشن میں حکومت کے علاوہ صوبائی ہوم سیکرٹری اور ڈپٹی ہوم سیکرٹری کو بھی فریق بنایا گیا تھا۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس وحیدالدین نے مسٹر بھٹو اور دوسرے لیڈروں کی نظر بندی کے خلاف دائر کی جانے والی رٹ درخواستوں کی سماعت کے لیے خاص ڈویژن بنچ قائم کرنے کا حکم دیا جو مسٹر جسٹس مشتاق حسین اور مسٹر جسٹس قاضی محمد گل پر مشتمل تھا۔

بیگم نصرت بھٹو نے اپنی رٹ درخواست میں کہا تھا ——— "۱۳ نومبر کو میرے شوہر کو، جب کہ وہ گلبرگ میں اپنے دوست ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ نمبر ۳۲ کے تحت، ڈپٹی ہوم سیکرٹری کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں میانوالی جیل میں نظر بند رکھا گیا ہے۔ چونکہ حکم میں نظر بندی کی میعاد نہیں بتائی گئی اس لیے اس کا مطلب ایک روز کی نظر بندی بھی ہو سکتا ہے اور اب جبکہ میرے شوہر کو میانوالی جیل میں منتقل کیا جا چکا ہے، یہ مدت ختم ہو چکی ہے اس لیے اُن کی نظر بندی کو جاری رکھنا خلاف قانون ہے۔ انہیں فوراً رہا کیا جائے۔

نظر بندی کی وجوہ اس درخواست کے ساتھ شامل ہیں۔ مجھے ان وجوہ کے درست ہونے کا کوئی علم نہیں۔ نہ ہی میں اپنے شوہر سے مل سکی کہ اس بات کا پتا چلتا کہ نظر بندی کی جو وجوہ بتائی گئی ہیں۔ وہ درست ہیں یا نہیں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ نہیں تھی اور نہ میں نے کسی ایسے جلسے میں شرکت کی جس سے میرے شوہر نے خطاب کیا ہو اور جہاں کوئی ایسی بات کہی ہو جس کی بنیاد پر نظر بندی کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ تاہم میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میرے شوہر نے کہیں بھی تشدد پر اکسانے یا اشتعال دلانے والی کوئی بات نہیں کہی۔ اگر عدالت اصل حقائق جاننا چاہتی ہے تو میرے شوہر کو عدالت میں طلب کرکے اُن کا بیان لینا چاہیے۔ عدالت کو اس کا اختیار بھی حاصل ہے جیسا کہ سپریم کورٹ نے ملک غلام جیلانی کے مقدمے میں کیا تھا۔ آغا شورش کاشمیری کے خلاف حکومت کی اپیل کے حالیہ فیصلے کی روشنی میں بھی میرے شوہر کو عدالت میں طلب کرکے اصل حقائق کی چھان بین کی جا سکتی ہے۔

میرے شوہر جب تک وزیر خارجہ رہے انہوں نے ایسی پالیسیاں وضع کیں جن کی وجہ سے دنیا کے تمام ملکوں میں پاکستان کا وقار بڑھ گیا۔ حکومت کے بعض عناصر میرے شوہر کی مقبولیت کی وجہ سے ان سے حسد کرنے لگے اور ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ میرے شوہر نے وزارتِ خارجہ چھوڑنے کے بعد خود کو ملک اور قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے ہر دلعزیز سیاسی لیڈر بن گئے۔ انہوں نے پاکستان کے عوام کی توقعات پوری کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ہمیشہ مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھا۔ انہوں نے عوام سے وعدہ کیا کہ وہ اُن کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کرتے رہیں گے۔ اس بات سے برسرِ اقتدار لوگ اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ میرے شوہر آئندہ انتخابات میں خود یا دیگر سیاسی جماعتوں کے اشتراک سے موجودہ صدرِ پاکستان کو شکست دے دیں گے۔ ان متوقع امکانات سے بچنے کے لیے میرے شوہر کو گرفتار کیا گیا ہے۔ انہیں اس سے پہلے کئی موقعوں پر ایسی دھمکی بھی

دی گئی تھی ۔ ان حالات میں میرے شوہر کی نظر بندی کا حکم بدنیتی پر مبنی ہے ۔

ڈیفنس آف پاکستان رولز مجریہ ۱۹۶۵ء کا نفاذ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران ہوا تھا ۔ صدر پاکستان نے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو کیا اور اسی روز ڈیفنس آف پاکستان رولز کا نفاذ عمل میں آیا ۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی کے بعد صدر پاکستان نے میرے شوہر کے ہمراہ امریکہ کا دورہ کیا ۔ جہاں انہوں نے امریکہ کے سابق صدر جانسن سے گفتگو کی ۔ امریکہ سے واپسی کے کچھ روز بعد صدرِ پاکستان میرے شوہر ، کئی دوسرے وزراء اور سیکرٹریوں کے ساتھ تاشقند گئے جہاں ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو صدرِ پاکستان اور بھارتی وزیراعظم آنجہانی شاستری کا مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا ۔ اور اس کے بعد بھارت سے جھڑپیں مکمل طور پر بند ہوگئیں ۔ جھڑپوں کے خاتمے اور خاص طور پر اعلان تاشقند کے بعد ہنگامی حالات کا برقرار رکھنا بالکل غیر آئینی اور غیر ضروری ہے ۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جن ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا تھا وہ تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور آئین کے مطابق ان کا وجود نہیں ہے ۔ اس لیے ہنگامی حالات کے تحت بنائے گئے رولز کو اب قوانین کی حیثیت حاصل نہیں اور اُن کے تحت کوئی کاروائی نہیں کی جا سکتی ۔ ان حالات میں میرے شوہر کے خلاف جاری کیے گئے نظر بندی کے احکام کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ۔

عدالت عالیہ آئین ، عوام کے حقوق اور آزادی کی محافظ ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ہنگامی حالات کے برقرار رہنے یا خاتمے کے بارے میں فیصلہ کرے ۔ عدالت عالیہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ آیا ہنگامی حالات کو برقرار رکھنا درست ہے یا نہیں ۔ نئے انتخابات کے پروگرام کا اعلان ہو چکا ہے اور انتخابات کے لیے تیاری کا کام آخری مرحلے پر ہے ۔ اس موقع پر ہنگامی حالات کو برقرار رکھنا نہ صرف آئین کے تحت دیئے گئے بنیادی حقوق بلکہ جمہوری تقاضوں کے بھی منافی ہے ۔

مُتذکرہ وجوہ کی بنیاد پر عدالت عالیہ سے استدعا ہے کہ میرے شوہر کی نظر بندی کے

بارے میں قرار دیا جائے کہ نظربندی کی مدّت پوری ہو چکی ہے اور انہیں آزاد کر دیا جائے۔ اگر میری یہ درخواست قبول نہ کی جائے تو میرے شوہر کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا جائے، تاکہ عدالت خود اس بات کا اطمینان کرے کہ میرے شوہر کو قانون کے مطابق نظربند کیا گیا ہے یا نہیں۔ میں نظربندی کے حکم کو معطل کرنے کی استدعا بھی کرتی ہوں۔"

۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے خصوصی بنچ نے بھٹو صاحب کی نظربندی کے خلاف رٹ درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی۔ فاضل ججوں نے درخواست کو سماعت کے لیے منظور کرتے ہوئے اپنے دو صفحات پر مشتمل حکم میں لکھا کہ درخواست دہندہ کے وکیل میاں محمود علی قصوری اور ایڈووکیٹ جنرل نے استدعا کی ہے کہ رٹ درخواست کی سماعت پندرہ روز کے بعد شروع کی جائے اس لیے یہ درخواست ۲ دسمبر کو پیش کی جائے۔

عدالت نے اٹارنی جنرل شریف الدّین پیرزادہ سے کہا کہ وہ بھی ۲ دسمبر کو پیش ہوں اور وکیل صفائی کے اس اعتراض کا جواب دیں کہ چونکہ ہنگامی حالات کا اعلان چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو کیا گیا تھا اور اب وہ حالات نہیں رہے اس لیے ہنگامی حالات کے دوران معرضِ وجود میں آنے والے ڈیفنس آف پاکستان رولز کا وجود بے کار ہو گیا ہے۔ اور ان کے تحت کارروائی غیر قانونی ہے۔

میاں محمود علی قصوری کی درخواست پر فاضل ججوں نے انہیں مسٹر بھٹو سے اس شرط پر تین مرتبہ ملاقات کرنے کی اجازت دے دی کہ یہ ملاقات ایک سرکاری افسر کی موجودگی میں ہوگی۔ البتہ وہ افسر ملاقات کے وقت اتنے فاصلے پر رہے گا کہ وکیل صفائی اور نظربند کے درمیان بات چیت کو نہ سُن سکے۔

عدالت کی ہدایت پر میاں محمود علی قصوری نے ایڈووکیٹ جنرل کو رٹ درخواست

اور اس کے ساتھ شامل کیے گئے کاغذات کی نقول فراہم کرنے کا یقین دلایا۔ ایڈووکیٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ وہ جواب میں اپنا تحریری بیان ایک ہفتے کے اندر عدالت میں پیش کر دیں اور اس کی نقل وکیل صفائی کو بھی فراہم کریں۔ وکیل صفائی پر واضح کیا گیا کہ وہ نظر بند سے ملاقات کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی درخواست میں ترمیم کرنے کے مجاز ہوں گے۔ فاضل ججوں نے قرار دیا کہ وکیل صفائی کی یہ درخواست منظور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ مسٹر بھٹو کو لاہور میں نظر بند کیا جائے۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل کو ہدایت کی کہ وہ حکومت سے کہیں کہ تمام نظر بندوں کو جن کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواستیں دائر کی گئی ہیں ایک ہی جیل میں رکھا جائے اور یہ جیل لاہور سے سو میل کے اندر اندر ہو۔ ایڈووکیٹ جنرل کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ ۲ر دسمبر کو وہ تمام ایسا مواد پیش کریں جس کی بنا پر نظر بندی کا حکم جاری کرنا ناگزیر تھا۔ جس افسر نے نظر بندی کے احکام پر دستخط کیے تھے وہ بھی ۲ر دسمبر کو عدالت میں پیش ہوں۔

ایک سوال کے جواب میں وکیل صفائی میاں محمود علی قصوری نے عدالت کو بتایا کہ وہ نظر بندی کے حکم کو معطل کرنے پر زور نہیں دیتے۔

۲ر دسمبر کو ہائی کورٹ کے احاطے میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ انھوں نے چیئرمین بھٹو زندہ باد کے نعرے لگائے۔ نعروں کا شور کمرۂ عدالت میں سنائی دیتا رہا۔ اس روز عدالتِ عالیہ کے خصوصی بنچ نے مسٹر احمد رضا خاں اور مسٹر غلام مصطفےٰ کھر کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواستوں کی سماعت کی اور اُن کی نظر بندی کے احکام غیر قانونی قرار دے دیئے۔

چیئرمین بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت کے دوران میاں محمود علی قصوری نے کہا کہ حکومت نے مسٹر بھٹو کے متعلق سو صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ

نقل بروقت مجھے مہیا نہیں کی، میں اسے پڑھنے کے بعد ہی دلائل پیش کرسکوں گا۔ انہوں نے ایک درخواست پیش کی جس میں بھٹو صاحب سے ملاقاتوں کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ:

"میانوالی اور پھر ساہیوال جیل میں بھٹو صاحب کے ساتھ انتہائی افسوس ناک سلوک روا رکھا گیا ہے۔ انہیں تنگ کرنے کے لیے قیدِ تنہائی دی گئی ہے۔ انہیں ریڈیو مہیا نہیں کیا گیا حالانکہ قواعد و ضوابط کے تحت وہ اس کے حق دار تھے۔ پاکستان ٹائمز اور مشرق کے سوا کوئی دوسرا اخبار مطالعہ کے لیے نہیں ملا (اُن دنوں یہ دونوں اخبارات حالاتِ حاضرہ کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتے تھے) ۲۲، نومبر تک بھٹو صاحب کا کوئی خط انہیں نہیں پہنچایا گیا۔ جب انہیں گرفتار کرکے میانوالی لایا گیا تو وہاں اُن سے جو کاغذات لیے گئے تھے وہ بھی ایک عرصے تک نہیں لوٹائے گئے۔ وہ سات کتابیں بھی جو وہ لاہور سے اپنے ساتھ لائے تھے روک لی گئیں اور ان کے بار بار کے اصرار پر قسطوں میں واپس کی گئیں۔ اگرچہ انہوں نے گرفتاری کے روز ہی قلم اور کاغذ کے لیے درخواست کی تھی لیکن ۱۷، نومبر کو جاکر کہیں انہیں ایک نوٹ بک مل سکی۔ اگلی سہ پہر کو انہیں ایک بال پوائنٹ قلم مہیا کیا گیا لیکن انہیں چونکہ دو ایک گھنٹے بعد میانوالی جیل سے ساہیوال جیل میں منتقل ہونا پڑ گیا اس لیے وہ ۱۹، تاریخ سے پہلے کچھ بھی نہ لکھ سکے۔ اپنے وکیلوں کو ہدایات دینے کے لیے لکھنے کا سامان مہیا کرنے کے بارے میں ان کی بار بار کی درخواست اس وقت تک بیکار ثابت ہوتی رہی جب تک انہوں نے صاف صاف یہ نہ کہہ دیا کہ میں مزید لیت و لعل برداشت کرنے کو تیار نہ ہوں گا۔

میانوالی جیل کی کوٹھڑی میں چوہوں اور مکھیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان پرندوں کی تو بات ہی چھوڑیے جنہوں نے اپنی بیٹھوں سے وہاں طوفان بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ اُن کا کھانا چند سبزیوں اور گوشت کی تین چار بوٹیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ بوٹیاں بھی

اس دن ملتی تھیں جب گوشت کا ناغہ نہیں ہوتا جبکہ انہوں نے اعتراض نہیں کیا انہیں گھٹیا ترین لال آٹے کی روٹی دی جاتی تھی۔ ساہیوال میں انہیں جو کوٹھری دی گئی تھی، وہ مچھروں اور مکھیوں کی آماجگاہ تھی اور چوہوں کی بجائے جن سے میانوالی جیل میں ان کا ساتھ تھا، اس جگہ چمگادڑوں کا راج تھا۔ اور تو اور غسل خانے کا انتظام یہاں میانوالی سے بھی بدتر تھا، وہاں کم از کم ان کے لیے الگ غسل خانہ تو تھا۔ ان کی یاد دہانیوں کے باوجود ۲۰ تاریخ سے پہلے انہیں پڑھنے کے لیے مناسب روشنی مہیا نہ کی گئی، ٹین کی جس تھالی میں انہیں کھانا دیا جاتا تھا وہ کتوں کے لیے مناسب ہو تو ہو۔ کھانا پکانے کے لیے سبزی کاٹنے کی چھری بھی نہیں دی گئی تھی۔ بتایا گیا کہ چھری اس لیے نہیں مل رہی کیونکہ یہ بات قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔ جب بھٹو صاحب نے توجہ دلائی کہ میانوالی میں ایسا نہیں کیا گیا تھا اور چھری کے بغیر کھانا تیار نہیں ہو سکتا تو بادلِ نخواستہ ایک کند سا اوزار دے دیا گیا جس سے آلو بھی نہیں چھیلے جا سکتے تھے۔ ۱۹ تاریخ کی رات تک کوئی رول بھی جو بھٹو صاحب کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا، ضرور بضرور استعمال کیا گیا اور کوئی رعایت جو ان کا حق ہو سکتی تھی وہ ہرگز ہرگز نہ کی گئی۔

اس نامناسب سلوک اور مخاصمانہ رویے کے پیشِ نظر بھٹو صاحب نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ملاقات کا مطالبہ کیا جو بیس تاریخ کی صبح کو ان سے ملنے آیا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ انہوں نے حکومت میں خاصا وقت کاٹا ہے اور انہیں اُس کی نسبت بہتر معلومات ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ سہروردی صاحب اور دوسرے رہنماؤں کے ساتھ قید میں کیسا سلوک ہوتا تھا۔ انہوں نے اُسے مطلع کیا کہ ایک وکیل کے طور پر انہیں قواعد و ضوابط اور اُن کے مفہوم سے بھی آگاہی ہے۔ بھٹو صاحب نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ کسی طرح کی سہولتیں یا مراعات نہیں مانگ رہے۔ لیکن وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ ان کے ساتھ کسی فی الواقع سزا یافتہ مجرم کا سا سلوک کیا جائے۔

اس گفتگو کے نتیجے میں صورتِ حال کچھ بہتر ہو گئی اور ان کی کوٹھری کا گرد آلود فرش ایک پھٹی پرانی دری سے سجا دیا گیا، کمرے میں مچھر مار تیل چھڑکا گیا اور کچھ برتنوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا جن میں سبزی کاٹنے کی چھری بھی شامل تھی۔ بھٹو صاحب کو سرِ شام ہی کوٹھری میں محبوس کرنے کا سلسلہ روک دیا گیا۔ ٹوٹی ہوئی کرسی بھی بدل دی گئی اور میز بھی بدلی گئی۔ اور اصلاحات کے طور پر کوٹھری میں دو ایک چیزوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن خوراک اور غسلخانے کا انتظام بدستور اصلاحات کے دائرے سے خارج تھا۔ یہی حال دوسرے بنیادی حالات کا تھا۔

اس کے باوجود بھٹو صاحب کا حوصلہ بلند رہا۔ ایک مرتبہ جب میاں محمود علی قصوری نے اُن سے ملاقات کے دوران جیل کے حالات کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ہنس کر کہا کہ انھوں نے قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں، اگر حکومت ان کو نظر انداز کرنے اور ان کے سماجی مرتبے کو بھلا دینے ہی پر تلی ہوئی ہے تو اُسے کم از کم اپنے آپ کو رسوائی سے بچانے کی تو فکر کرنی چاہیئے۔ بھٹو صاحب نے کہا

> "جتنا بھی زور دیا جا سکتا ہے دیتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ میں نہ رعائتیں چاہتا ہوں اور نہ خصوصی سہولتیں۔ خداوند تعالیٰ کے کرم اور پاکستان کے عوام کی گرمجوش محبت کی بدولت مجھ میں ہر طرح کے مصائب سہنے کی سکت ہے۔"

عدالت نے اس درخواست پر کوئی حکم جاری نہیں کیا۔ مسٹر قصوری نے اصرار کیا کہ مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کیا جائے۔ وہ ان کی موجودگی میں بہتر طور پر دلائل پیش کریں گے۔

ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت سے استدعا کی کہ نظر بندوں کے بارے میں جو سرکاری دستاویزات پیش کی جائیں اُن کی اشاعت کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ ان کے ظاہر

ہونے سے مفاد عامہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے ۔ فاضل ججوں نے یہ درخواست مسترد کر دی ۔

عدالت نے بھٹو صاحب کی رٹ درخواست کی سماعت شروع کرنے سے قبل، دوسرے لیڈروں کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواستوں کی سماعت کی۔ ۱۲ر دسمبر کو فاضل ججون نے مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کرنے کے سلسلے میں میاں محمود علی قصوری اور ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل سُنے اور مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کرنے کی درخواست منظور کرلی ۔

میاں محمود علی قصوری نے اپنی درخواست کے سلسلے میں دلائل پیش کرتے ہوئے کہاکہ آئین کے تحت عدالتِ عالیہ کو انصاف کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھنے کے لیے کسی نظر بند کو عدالت میں طلب کر کے اُسے اپنا موقف واضح کرنے کا موقع دینے کے جو اختیارات حاصل ہیں اُن کو استعمال نہ کرنا گویا ایسا ہے جیسے اختیارات حاصل ہی نہیں ہیں۔ ان اختیارات کا استعمال وہاں تو لازمی ہو جاتا ہے جہاں نظر بند خود عدالت میں پیش ہونے کی درخواست کرے ۔ اور اس خدشے کا اظہار کرے کہ اگر اُسے طلب نہ کیا گیا تو اس کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر طلب کرنے میں نظر بند کو فائدہ پہنچتا ہو تو اس کی درخواست اور بھی قابلِ قبول بن جاتی ہے ۔ کئی ایسی باتیں ہیں، جن کا علم صرف مسٹر بھٹو کو ہے اور جن کا مناسب موقع پر اظہار اُن کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے ۔ مسٹر بھٹو نہ صرف اعلیٰ یافتہ ہیں بلکہ بیرسٹر بھی ہیں۔ ہوم سیکرٹری پر جرح کے دوران اُن کا موجود ہونا ضروری ہے ۔ ویسے بھی سائل کو بعض ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جن سے اُس کا وکیل بے خبر ہوتا ہے ۔ ہوم سیکرٹری پر جرح کے دوران ممکن ہے میں کوئی لازمی اور ضروری سوال فراموش کر جاؤں ۔ عدالت میں موجود ہونے کی صورت میں

سائل (مسٹر بھٹو) مجھے یاددہانی کرا سکتے ہیں۔ بعض اوقات وکیل کو عین وقت پر بھی سائل سے کوئی اہم سوال کرنا پڑتا ہے۔

میاں محمود علی قصوری نے کہا کہ نظر بندی کا حکم بے قاعدہ ہے اور اس بے قاعدگی کے بارے میں مسٹر بھٹو ہی واضح طور پر بتا سکیں گے۔ اُن کی موجودگی سے نہ صرف عدالت کو مدد ملے گی بلکہ خود سائل کا یہ خدشہ بھی دور ہو جائے گا کہ ان کے ساتھ بے انصافی کا امکان ہے۔

ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظر بند کو یہ حق نہیں کہ وہ عدالت سے یہ استدعا کرے کہ اُسے عدالت میں طلب کیا جائے۔ مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کرنے کی درخواست اس لیے کی گئی ہے کہ اخبارات میں سُرخیاں شائع ہو سکیں اور عوام میں ہیجان پیدا کیا جا سکے۔ اگر مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کیا گیا تو شہر میں امن برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اور نہ ہی عدالت پورے سکون سے کارروائی جاری رکھ سکے۔ انہوں نے نظر بندی کے خلاف رٹ درخواستوں کی سماعت کے پہلے روز عدالت عالیہ میں لوگوں کے ہجوم اور نعروں کی طرف عدالت کی توجہ دلائی جالانکہ اُس روز مسٹر بھٹو کا مقدمہ زیرِ سماعت نہیں تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ اگر مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کیا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو جانے کا خطرہ ہے اور انتظامیہ کو امن برقرار رکھنے کے لیے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایڈووکیٹ جنرل نے مزید کہا کہ جن دستاویزات کی بنیاد پر نظر بند کے خلاف نظر بندی کا حکم جاری کیا گیا ہے، وہ پہلے ہی عدالت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ عدالت کو ان دستاویزات کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ نظر بندی کا حکم جاری کرنے والی اتھارٹی نے حکم جاری کرنے سے قبل ان پر اچھی طرح غور کیا تھا یا نہیں۔ نظر بند کو عدالت میں طلب نہ کرنے کی صورت میں صحیح انصاف نہ ملنے کے جن خدشات کا اظہار کیا گیا ہے ان کی تفصیل بتانی ضروری

ہے ۔ نظر بند کو عدالت میں طلب کر لیا جائے تو بھی کسی نئی بات کا انکشاف نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ نظر بند کو تو نہیں کرنا کہ اس کی نظر بندی کے لیے جو حکم جاری کیا گیا ہے ۔ وہ درست ہے یا غلط۔

میاں محمود علی قصوری اور راجہ سید اکبر کے دلائل سننے کے بعد فاضل ججوں نے حکم دیا کہ مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کرنے کے بجائے عدالت خود جیل جاکر درخواست کی سماعت کرے گی۔ فاضل ججوں نے قرار دیا کہ مسٹر بھٹو کو عدالت میں طلب کرنے یا عدالت کا خود مسٹر بھٹو کے پاس جانے کا ایک ہی مطلب ہے۔ عدالت نے کہا کہ مسٹر بھٹو کی درخواست کی سماعت ہائی کورٹ کی تعطیلات کے بعد ۸ جنوری ۱۹۶۹ء کو کی جائے گی۔ اس روز ہوم سیکرٹری کا بیان قلم بند ہوگا اور نظر بند کی موجودگی میں ہوم سیکرٹری پر جرح بھی کی جائے گی۔

فاضل ججوں نے حکم دیا کہ سماعت سے دو روز قبل مسٹر بھٹو کو لاہور جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ اس دوران میاں محمود علی قصوری جیل میں مسٹر بھٹو سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے اُن سے ملاقات کے مجاز ہوں گے۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل کو ہدایت کی کہ متعلقہ حکام سے کہا جائے کہ میاں محمود علی قصوری جتنی مرتبہ نظر بند مسٹر بھٹو سے ملاقات کرنا چاہیں انہیں اجازت دے دی جائے۔ فاضل ججوں نے میاں محمود علی قصوری کی یہ درخواست مسترد کر دی کہ ملاقات کے دوران اُن کے ایک نائب کو بھی ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔

ہوم سیکرٹری کا بیان اور جرح

عدالت کے حکم کے مطابق سات جنوری کو بھٹو کو ساہیوال جیل سے لاہور پہنچا دیا گیا۔ انہیں شروع میں میانوالی جیل میں نظر بند کیا تھا اور بعد میں عدالت کے اس حکم کے تحت کہ جن سیاسی لیڈروں کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواستیں دائر کی گئی ہیں انہیں ایک جیل میں رکھا جائے، ساہیوال جیل لایا گیا تھا۔

بورسٹل جیل لاہور میں بھٹو صاحب کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت ۸ جنوری کے بجائے ۹ جنوری کو شروع ہوئی کیونکہ سماعت شروع کرنے کی تاریخ ایک روز کے لیے بڑھا دی گئی تھی۔

۹ جنوری

۹ جنوری کو بورسٹل جیل لاہور میں عدالت عالیہ کے ایک خصوصی بنچ کے روبرو جو مسٹر جسٹس مشتاق حسین اور مسٹر جسٹس محمد گل پر مشتمل ہے۔ مسٹر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت شروع ہوئی یہ رٹ درخواست ۱۴ نومبر ۱۹۶۸ء کو مسٹر بھٹو کی اہلیہ مسز نصرت بھٹو نے دائر کی تھی۔

رٹ درخواست کی سماعت کے لیے عدالت کی ہدایت پر بورسٹل جیل کے مشرقی

حصّے میں خصوصی انتظامات کیے گئے تھے جیل کے احاطے کے باہر بھاری تعداد میں پولیس تعینات تھی تاکہ کوئی ناخوش گوار واقعہ نہ ہونے پائے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور طالب علموں کی ایک بڑی تعداد بھی جیل کے باہر جمع تھی۔ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعرے لگائے اور گورے چھوڑ کا چیئرمین بھٹو کو سلامی دی۔ ان گولوں کی آواز کمرۂ عدالت میں بھی سنائی دیتی رہی۔

جب بھٹو صاحب کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو وہ خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ وہ کارڈرائے کے سوٹ اور بوسکی کی قمیض میں ملبوس تھے اور ان کی صحت بھی اچھی تھی۔

عدالت کی کاروائی شروع ہونے پر درخواست دہندہ کے وکیلوں کے سربراہ میاں محمود علی قصوری کھڑے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں کاروائی سننے کے لیے مسٹر بھٹو کے رشتہ داروں کو اجازت دینے کے سلسلے میں عدالت کے نقطۂ نظر کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں نظر بند کے تقریباً ۲۲ رشتہ دار جو لاہور کے باہر سے آئے ہیں، کاروائی سننے کے لیے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ بھٹو صاحب کے بہت سے رشتہ داروں کو پاس جاری نہیں کیے گئے اور وہ باہر انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے استدعا کی کہ کمرۂ عدالت میں بہت سی نشستیں خالی ہیں اس لیے ان لوگوں کو کاروائی سننے کی اجازت دے دی جائے۔

خصوصی بنچ کے سینئر جج مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا کہ انہیں اطلاع دی گئی ہے کہ درخواست دہندہ مسز نصرت بھٹو بعض افراد کو پاس نہ جاری ہونے کے خلاف احتجاج کے طور پر جیل کے باہر بیٹھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک درخواست دہندہ اور ایک خاتون کے طور پر مسز نصرت بھٹو کا احترام کرتے ہیں لیکن کسی کی طرف سے دھمکیاں برداشت نہیں کریں گے "ہم اس قسم کے رویے کے عادی نہیں ہیں"۔

فاضل جج کے ان ریمارکس پر بھٹو صاحب کھڑے ہو گئے اور یہ کہہ کر واک آؤٹ کرنے لگے کہ "میرے خاندان کی توہین ہوئی ہے۔"

فاضل جج :- "آپ کمرۂ عدالت سے باہر نہیں جا سکتے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے آپ اس وقت عدالت کی تحویل میں ہیں، آپ بیٹھ جائیے۔"

اس موقع پر محمود علی قصوری صاحب نے مداخلت کی اور بھٹو صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا "عدالت خالی نشستوں کے مطابق کارروائی سننے کے لیے لوگوں کو اجازت دے دے گی۔" عدالت نے محمود علی قصوری صاحب سے کہا کہ وہ خالی نشستوں کو گنیں۔ قصوری صاحب نے نشستوں کو گن اور عدالت کو بتایا کہ تقریباً ۲۵ نشستیں خالی پڑی ہیں۔ اس پر عدالت نے کارروائی سننے کے خواہش مند لوگوں کو پاس جاری کرنے کی ہدایت کی۔ چند منٹ بعد بھٹو صاحب کے تمام رشتہ دار کمرۂ عدالت میں آگئے۔ مسٹر بھٹو بڑی گرمجوشی سے اپنے بچوں کو ملے اور پھر مقدمے کی کارروائی خوش گوار ماحول میں شروع ہو گئی۔

صوبائی حکومت کے ہوم سیکرٹری مسعود نبی نور نے عدالت کو اپنا حلفیہ بیان پیش کیا۔ انھوں نے اپنا وہ تفصیلی نوٹ بھی پیش کیا جو انھوں نے صوبے میں نظم و نسق کی صورت حال کے بارے میں ۱۱ نومبر کو صوبائی گورنر کو بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سپیشل برانچ مسٹر عبدالقیوم کی رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کی۔

صوبائی ہوم سیکرٹری نے سرکاری اور نجی جائیدادوں کو پہنچنے والے نقصان کی فہرست اور بھٹو صاحب کی نظر بندی کے سلسلے میں صوبائی گورنر کا جاری کردہ حکم بھی عدالت کے سامنے پیش کیا۔

جس فائل پر گورنر نے بھٹو صاحب کی نظر بندی کے احکام جاری کیے تھے، اس

میں پیپلز پارٹی سندھ زون کی پرائیویٹ کنونشن کی کارروائی کے اقتباسات بھی موجود تھے۔ یہ کنونشن ۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء کو حیدر آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ فائل میں میونسپل پارک کوہاٹ میں منعقد ہونے والے پیپلز پارٹی کے جلسے کی کارروائی بھی موجود تھی جو ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ ہوم سیکرٹری نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو بھٹو صاحب کی چارسدہ میں آمد کی کارروائی اور ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو لاہور ڈسٹرکٹ بار کی کارروائی کے اقتباسات بھی پیش کیے۔

پولیس کے ایک افسر آغا محمد علی خاں کی انفرمیشن رپورٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کی یکم نومبر ۱۹۶۸ء کی پولیس ڈائری کی رپورٹ بھی پیش کی گئی۔

ہوم سیکرٹری نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا کہ:۔

میں نے صوبے میں امن وامان کی صورتِ حال اور نظربند مسٹر زیڈ اے بھٹو سمیت متعدد افراد کی امن عامہ کے منافی سرگرمیوں کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ گورنر مغربی پاکستان کو ارسال کیا تھا۔ میں نے اپنے نوٹ کے ساتھ تمام متعلقہ مواد بھی بھیجا تھا۔ جو پہلے ہی عدالت کے سامنے پیش کیا جاچکا ہے)

میری معلومات کا بڑا ذریعہ مغربی پاکستان پولیس کی سپیشل برانچ تھی جو مجھے اطلاعاتی رپورٹیں، روزانہ صورتِ حال کی رپورٹیں اور صوبے میں امن وامان کی صورتِ حال کے بارے میں رپورٹیں بھیجتی رہی۔

مجھے انسپکٹر جنرل پولیس سے بھی رپورٹیں موصول ہوتی رہیں جن میں خاص طور پر صوبے اور اس کے مختلف حصوں میں امن وامان کی صورت حال کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے ڈپٹی کمشنروں سے پندرہ روزہ رپورٹیں اور سپیشل رپورٹیں بھی ملتی رہیں۔ ایک خاص وقت پر ایک خاص صورت حال کا اندازہ لگانے کے لیے میں اخباری رپورٹوں سے بھی استفادہ کرتا رہا۔

مجھے علم ہے کہ صوبائی گورنر کو پولیس کے مختلف شعبوں کی طرف سے براہِ راست رپورٹیں بھی بھیجی جاتی ہیں، وہ بذریعہ ٹیلیفون مختلف فیلڈ افسروں سے بھی رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ انہیں سرکاری افسروں اور غیر سرکاری آدمیوں کے ذریعہ بھی اطلاعات ملتی ہیں۔

مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں جو مختلف اطلاعات موصول ہو رہی تھیں اُن سے میں نے یہ تاثر قائم کیا کہ صوبے میں امن و امان کی صورتِ حال تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ اور لوٹ مار، آتشزنی، توڑ پھوڑ، غنڈہ گردی اور لاقانونیت کا جو سلسلہ کراچی سے شروع ہوا تھا وہ صوبے کے دوسرے حصّوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ لہٰذا خاص طور پر یکم نومبر ۱۹۶۸ء کے بعد کی صورتِ حال مسلسل میرے زیرِ غور رہی۔

جب نظر بند نے مایوس عناصر کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی مہم کا آغاز کیا تو جنوبی علاقے کے طلبا اور مزدوروں میں عام بے اطمینانی پائی جاتی تھی لیکن باقی ماندہ صوبے میں صورتِ حال نسبتاً ٹھیک تھی۔ نظر بند نے گذشتہ سال ۲۱ ستمبر کو، اپنے براہِ راست حملے کے لیے، خاص طور پر جنوبی علاقے میں حیدر آباد کا مقام منتخب کیا تھا۔

حیدر آباد میں پیپلز پارٹی کی کنونشن میں اپنی تقریر میں نظر بند نے طلبا کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ حکومت طلبا پر جو مظالم کر رہی ہے اور طلبا نے ان مظالم کے خلاف جو جدوجہد شروع کی ہے اس میں پیپلز پارٹی طلبا کے ساتھ ہے۔ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا کہ طلبا کی اس جدوجہد کی یاد میں ملک کے مختلف حصّوں میں یادگاریں تعمیر کی جائیں گی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو چارسدہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس وعدے کو دہرایا تھا۔ انہوں نے عوام اور خصوصاً طلبا کو اکسایا تھا اور کہا تھا: "وہ وقت آئے گا جب ملک میں خون خرابہ ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی نہیں، یہ تو کامن سنس ہے۔ کہا جائے گا کہ میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں بغاوت بھی پھیلاؤں گا۔ میں اس

سے نہیں ڈرتا۔ میں سب سے پہلے اپنا خون دوں گا۔ انقلاب میں ہم خون خرابے سے نہیں ڈرتے۔ ہم سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں اور اپنی کشتیوں کو جلا دیا ہے"

۲۵ اکتوبر کو کوہاٹ کے میونسپل پارک میں ایک جلسۂ عام میں بھی انہوں نے اسی انداز میں تقریر کی تھی۔ صدر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: "صدر ایوب خان نے بہت مظالم کیے ہیں۔ انہوں نے بہت خون بہایا ہے۔ عوام بزدل نہیں البتہ اُن کے لیڈر بزدل ہیں"

اس جلسہ عام میں نظر بند نے یہ بھی کہا تھا: "اگر موجودہ حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بزورِ قوت اقتدار پر قبضہ کر لوں گا۔ اگرچہ میرے پاس پستول نہیں ہے۔ تاہم میں اپنے بھائیوں یعنی طلبا، مزدوروں اور کسانوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کروں گا"۔ انہوں نے مزید کہا کہ "حکومت کمزور ہو چکی ہے اور اب اُسے آخری ٹھوکر کی ضرورت ہے"۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو چارسدہ کے جلسہ عام میں نظر بند نے کہا تھا۔ "پٹھانوں اور مجھ میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ وہ بھی منتقم مزاج ہیں اور میں بھی منتقم مزاج ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ انتقام کا وقت تیزی سے قریب آ رہا ہے"۔

گذشتہ سال گیارہ نومبر نظر بند نے لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ارکان سے خطاب کیا تھا۔ انہیں کہا گیا تھا کہ وہ طلبا سے اپیل کریں کہ تشدد نہ کریں۔ لیکن انہوں نے اس قسم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "طلبا اپنے جائز مطالبات کے حصول کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں اور میں اُن کے ساتھ ہوں"۔ پولیس فائرنگ سے جاں بحق ہونے والے طالب علم کا ذکر کرتے ہوئے نظر بند نے کہا تھا کہ اس طالب علم کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔

نظر بند نے نہ صرف دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کی دھمکی دی تھی بلکہ ڈیرہ اسماعیل

میں ایک اجتماع میں تقریر کر کے، فی الواقع دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی۔ ۲۵ ، اکتوبر کو انہوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پشاور کے ہوائی اڈے پر بھی ایک اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

گذشتہ سال یکم نومبر کو ڈیرہ اسماعیل خاں میں بھی انہوں نے اس قسم کی تمام پابندیوں کو توڑنے کی دھمکی دی تھی اور ایسے اقدامات کیے تھے جس سے صوبے میں امن وامان کی سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی اور اس بات کا شدید خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہ اپنے مجوزہ دَورے میں امن وامان کو خراب کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

مختلف مقامات پر سامعین کو لاقانونیت پر اُکسانے کے لیے نظر بند نے نہ صرف الفاظ استعمال کیے تھے بلکہ اپنے ہاتھوں کی حرکتوں سے بھی عوام کو مشتعل کیا تھا اور حکومت کے خلاف نفرت پھیلائی تھی۔

مثال کے طور پر گذشتہ سال ۱۲، ستمبر کو حیدر آباد میں انہوں نے اپنا کوٹ اتار دیا اور آستین چڑھا لیں اور اس طرح اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ حکومت کی مخالفت میں طاقت استعمال کریں گے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں بھٹو صاحب کے ایک خاص آدمی، حق نواز گنڈا پور نے بندوق بلند کر کے یہ کہا تھا "ہم لڑائی کے لیے تیار ہیں"۔ اس موقع پر مسٹر بھٹو نے بھی مُکا دکھا کر حق نواز کے اس چیلنج کی تائید کی تھی۔

گذشتہ سال ۱۲، ستمبر کو حیدر آباد میں نظر بند نے اپنی تقریر میں سرکاری راز بھی افشا کیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ انڈونیشیا نے ہمیں ہوائی جہاز اور آبدوزیں مہیا کی تھیں۔ اب پاکستان اندرون ملک اور بیرون ملک ہمدردی سے محروم ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایران، چین اور انڈونیشیا اب ایک پُرزہ بھی نہیں دیں گے۔ اس قسم کے انکشافات سے دوسری طاقتوں سے پاکستان کے تعلقات خراب ہونے کا امکان ہے۔

نظر بند نے جن مقامات کا دورہ کیا، اُن میں سے اکثر جگہ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان،

راولپنڈی اور دوسری جگہوں پر، امن عامہ میں خلل پڑا۔ اور سرکاری اور نجی جائیدادوں کو نقصان پہنچا۔

نظر بند کا پورے مغربی پاکستان کا دَورہ کرنے کا پروگرام تھا تاکہ وہ طلبا اور دوسرے لوگوں سے رابطہ قائم کریں اور انھیں تشدد پر اکسائیں۔ وہ ۱۳ ر نومبر ۱۹۶۸ء کو ملتان جانے والے تھے اور پھر سکھر اور دوسری جگہوں کا دَورہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ان حالات میں گورنر مغربی پاکستان کو مذکورہ بالا مواد میں پیش کردہ حقائق اور واقعات پر غور کرنے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ مسٹر زیڈ اے بھٹو ایسی کارروائیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں جو پاکستان کی سلامتی، عوام کے تحفظ، ملکی مفادات امن عامہ کی برقراری اور صوبے میں پُرامن حالات کے قیام کے منافی ہیں۔

گورنر کو یہ یقین بھی ہو گیا کہ نظر بند کو ایسی کارروائیوں سے روکنے کے لیے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے قاعدہ نمبر ۳۲ کے تحت ان کی گرفتاری اور نظر بندی ناگزیر ہے

ہوم سیکرٹری مسٹر مسعود نبی نور کے اس حلفیہ بیان کے بعد درخواست دہندہ کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے اُن پر جرح شروع کی۔

ایک سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ ان کے خیال میں گورنر نے مسٹر بھٹو کی نظر بندی کا حکم ۱۲ ر نومبر ۱۹۶۸ء کو لاہور میں جاری کیا تھا۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نظر بند کے متعلق، مختلف دستاویزات پر مشتمل فائل ۱۱ ر نومبر ۱۹۶۸ء کو گورنر کے پاس موجود تھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ وہ فائل بھیجنے کے بعد اور مسٹر بھٹو کی نظر بندی کا حکم جاری ہونے سے قبل، گورنر سے ملے تھے۔ ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ ملاقات گیارہ دسمبر کو بعد دوپہر راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ بہرحال انھوں نے وضاحت کی کہ مذکورہ ملاقات نظر بندیوں کے سلسلے میں

نہیں تھی۔ یہ ملاقات شام کے ساڑھے پانچ اور ساڑھے سات کے درمیان ہوئی تھی —

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ انہوں نے اپنا نوٹ ۱۱ نومبر کو دن کے آٹھ اور ساڑھے دس بجے کے درمیان لاہور میں لکھا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ انہوں نے ہوائی جہاز میں سفر کیا تھا۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے کہا کہ کیس سے متعلق فائل گورنر کے ہوائی جہاز میں راولپنڈی بھیجی گئی تھی۔

ہوم سیکرٹری نے کہا: "ایک اور رٹ پٹیشن میں جرح کے دوران میں نے واضح الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ فائل سٹاف کار کے ذریعے بھیجی گئی تھی"۔ انہوں نے کہا کہ اب انہوں نے تصدیق کی ہے کہ فائل ہوائی جہاز میں راولپنڈی لے جائی گئی تھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ چیف سیکرٹری کے پرنسپل سیکرٹری مسٹر نذیر احمد فائل لے کر راولپنڈی گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے اسی ہوائی جہاز میں سفر کیا تھا۔ بہرحال انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پرنسپل سیکرٹری مذکورہ فائلیں لے کر جا رہے ہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ انہوں نے فائل ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو دو بجے سہ پہر اپنے پرنسپل سیکرٹری کے سپرد کی تھی۔

ہوم سیکرٹری نے وضاحت کی کہ اُسی روز جب وہ اپنے دفتر سے گھر پہنچے تو انہیں چیف سیکرٹری نے ٹیلی فون کیا کہ وہ فوراً ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں جہاں گورنر کا طیارہ پرواز کے لیے کھڑا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ طیارہ ڈھائی اور ساڑھے تین بجے سہ پہر کے درمیان روانہ ہوا۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے بتایا کہ وہ طیارے کے ذریعے راولپنڈی پہنچنے کے بعد ہوائی اڈے سے سیدھے ویسٹ پاکستان ہاؤس نہیں گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے وہ کمشنرز ہاؤس گئے اور پھر صدر کا استقبال کرنے کے لیے جو پشاور سے راولپنڈی واپس آ رہے تھے، ہوائی اڈے پر واپس آئے۔ اس کے بعد وہ ویسٹ پاکستان ہاؤس گئے۔

ہوم سیکرٹری نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا کہ جب وہ ویسٹ پاکستان ہاؤس گئے تو مسٹر نذیر احمد کار میں ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ جس کار میں وہ ویسٹ پاکستان ہاؤس گئے۔ اس میں چیف سیکرٹری اور سیکرٹری قانون اُن کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا کہ چیف سیکرٹری اور سیکرٹری قانون اسی طیارے میں راولپنڈی گئے تھے جس میں انہوں نے سفر کیا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں، ہوم سیکرٹری نے کہا کہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس طیارے میں وہ سفر کر رہے ہیں فائل اسی طیارے کے ذریعے لے جائی گئی۔ انہوں نے مزید وضاحت کی کہ انہیں اسی طیارے کے ذریعے فائل بھیجنے کا اُس وقت پتا چلا۔ جب انہوں نے فائل بھیجنے کے بارے میں ایک سوال کے بعد اپنے دفتر سے اس سلسلے میں معلوم کیا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جہاں تک انہیں معلوم ہے چیف سیکرٹری نے اس فائل کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا کہ کیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس معاملے میں چیف سیکرٹری سے گفتگو نہیں کی؟ اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ اس بات کی تردید کر سکتے ہیں کہ نظم و نسق کے معاملات میں چیف سیکرٹری سے مشورہ کرنے کا دستور ہے، ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اگرچہ سیکرٹریوں کے لیے چیف

سیکرٹری سے مشورہ ضروری نہیں تاہم بعض اوقات وہ اُن سے مشورہ کر لیتے ہیں۔
انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا کہ نظم ونسق سے متعلق اہم معاملات میں ہوم سیکرٹری چیف سیکرٹری سے مشورہ کرتا ہے۔
میاں محمود علی قصوری: "میں کہتا ہوں کہ آپ نے چیف سیکرٹری کو اس لیے اندھیرے میں رکھا کہ آپ جانتے تھے کہ چیف سیکرٹری نظر بندی کے سلسلے میں آپ سے اتفاق نہیں کریں گے۔"
ہوم سیکرٹری: "یہ غلط ہے۔ اگرچہ مختلف سیکرٹری اہم معاملات پر نوٹ لکھنے سے قبل چیف سیکرٹری سے مشورہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ بعض اوقات مشورہ نہیں بھی کیا جاتا۔ بہرحال میں چیف سیکرٹری سے نظم ونسق کی عام صورتِ حال کے بارے میں بات چیت کرتا رہا جو نومبر ۱۹۶۸ء میں بعض لیڈروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔"
ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ وہ نظر بندی کے سلسلے میں صوبائی وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ سے مشورہ نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ وہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو دورے پر تھے۔
ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو جب انہوں نے اپنا نوٹ لکھا مسٹر بھٹو لاہور میں تھے۔ جب اُن سے یہ پوچھا گیا کہ کیا اُس وقت لاہور میں نظم ونسق کی غیر معمولی صورتِ حال تھی تو ہوم سیکرٹری نے کہا کہ نظم ونسق کی عام صورتِ حال خراب تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ بھٹو صاحب نے ۱۱ نومبر کو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لاہور میں تقریر کی تھی۔
جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا انہوں نے گورنر کے نام اپنے نوٹ میں ۱۱ نومبر کو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے جلسے کا بھی ذکر کیا تھا تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

میاں محمود علی قصوری نے ہوم سیکرٹری کو بتایا کہ انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنا نوٹ ۱۱ر نومبر کی صبح کو آٹھ اور گیارہ بجے کے درمیان لکھوایا جبکہ بار کا جلسہ دوپہر کے وقت ہوا تھا۔ یہ دونوں باتیں ہم آہنگ کیسے ہو سکتی ہیں۔

ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اُن کے سٹینو تقریباً ڈیڑھ بجے نوٹ ٹائپ کر کے لائے تھے۔ جب وہ ٹائپ شدہ نوٹ پڑھ رہے تھے تو انہیں ایک ٹیلیفون آیا جس سے انہیں طلباء کے متعلق مسٹر بھٹو کے ریمارکس کا پتا چلا۔

ہوم سیکرٹری نے کہا کہ پھر انہوں نے ڈسٹرکٹ بار میں مسٹر بھٹو کی تقریر کے متعلق سطریں سٹینو کو لکھوا دیں، سٹینو نے نوٹ پھر ٹائپ کیا اور دستخط کرانے کے لیے دوبارہ ٹائپ شدہ نوٹ سہ پہر ۲ بجے لے کر آیا۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ دو بجے سہ پہر دفتر سے گھر روانہ ہوئے۔ ابھی وہ برآمدے ہی میں تھے کہ انہیں چیف سیکرٹری کا ٹیلی فون موصول ہو گیا۔

چائے کے وقفے کے بعد جب سماعت دوبارہ شروع ہوئی تو درخواست دہندہ کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے ہوم سیکرٹری سے سوال کیا کہ ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کا اجلاس کس وقت ہوا تھا۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ اجلاس ساڑھے بارہ بجے اور ڈیڑھ بجے کے درمیان ہوا تھا۔

ہوم سیکرٹری نے درخواست دہندہ کے وکیل کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ نوٹ لاہور میں نہیں، راولپنڈی میں تیار کیا گیا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء کو وزیرِ داخلہ لاہور میں موجود نہیں تھے۔ بہر حال وہ یہ نہ بتا سکے کہ قاضی فضل اللہ کب لاہور سے باہر گئے تھے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ وزیرِ داخلہ کے دَورے کا پروگرام اُن کے پاس آیا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ نجی اور سرکاری املاک کے نقصان کی فہرست میں ۱۱، نومبر کو لاہور، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خاں، شیر پاؤ اور چارسدہ میں کسی نقصان کا ذکر نہیں ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ گورنر کو نوٹ کے ساتھ دستاویزات کی کوئی فہرست نہیں بھیجی گئی تھی۔

انہوں نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ قریبی ترین واقعہ جس کا فائل میں ذکر ہے ۲۱، ستمبر ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا درست ہے کہ نظر بندی کی وجوہ میں پانچ کے سوا کوئی اور مخصوص وجہ نہیں ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ ان کے علاوہ مختلف واقعات اور مشاہدات بھی نظر بندی کی وجوہ میں شامل ہیں۔

ہوم سیکرٹری سے سوال کیا گیا کہ نوٹ تیار کرتے وقت انہوں نے کن دستاویزات پر انحصار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے آغا محمد علی خاں کی ۲۵، اکتوبر ۱۹۶۸ء کی انفرمیشن رپورٹ اور یکم نومبر کی سپیشل برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کی سیاسی ڈائری پر انحصار کیا تھا۔

اُن سے پوچھا گیا کہ وہ کون سا مواد تھا جس کے بارے میں یہ سمجھا گیا ہے کہ اُس نے لوگوں کو بھڑکایا ہے۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ یہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کو حیدر آباد میں مسٹر بھٹو کی تقریر تھی۔

انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں پیپلز پارٹی کے دفتر میں کی گئی تقریر کا بھی ذکر کیا، جس میں مسٹر بھٹو نے کہا تھا "میدان میں آستینیں اوپر کرو رہماری آستین اوپر ہے"۔ اور اس کے بعد مسٹر بھٹو نے اپنی آستینیں اوپر چڑھالی تھیں۔ اس پر ہجوم میں سے ایک آدمی نے اپنی رائفل بلند کرتے ہوئے کہا: "ہم مقابلے کو تیار ہیں"۔ مسٹر بھٹو نے بھی تقریباً تیس سیکنڈ تک اپنا مُکا ہوا میں لہرایا تھا۔

حیدر آباد کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اس تقریر میں مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ وہ انڈونیشیا سے آبدوزیں اور طیارے لے کر آئے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ اب حکومت ایران، چین اور انڈونیشیا سے ایک فاضل پُرزہ بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سرکاری راز افشا کرنے کے مترادف ہے۔ اور اس قسم کے انکشافات سے پاکستان کے دوسری طاقتوں سے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔

اس پر قصوری صاحب نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ اس بات پر غور کریں اور بتائیں کہ "اس قسم کے انکشافات سے پاکستان کے دوسری طاقتوں سے تعلقات ہو سکتے ہیں" سے ان کا قطعی طور پر کیا مطلب ہے۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ اس فقرے کی مزید وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔

قصوری صاحب نے سوال کیا کہ اس میں کن دوسری طاقتوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اس لفظ کو سیاق و سباق میں پڑھا جائے تو اس میں ایران، چین اور انڈونیشیا آتے ہیں۔ اگرچہ "دوسری طاقتیں" ایک بہت وسیع اصطلاح ہے اور اس میں دوسری طاقتیں بھی آتی ہیں۔

قصوری صاحب کی اس بات کے جواب میں کہ "دوسری طاقتوں" میں ایران، چین اور انڈونیشیا شامل نہیں ہیں کیوں کہ ان کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جب قصوری صاحب نے یہ پوچھا کہ کیا وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری طاقتوں سے مراد دوسرے ملک ہیں تو ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ طاقتیں ملکوں کے ہم معنی نہیں ہیں۔ بہر حال ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بعض اوقات ایک یا دو ملک ایک طاقت کے مترادف سمجھے جا سکتے ہیں۔

قصوری صاحب نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ ان ملکوں کے نام بتائیں جو "دوسری طاقتوں" کے سیاق و سباق میں شامل ہیں۔

اس مرحلے پر عدالت نے مداخلت کی اور ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ قطعی جواب دیں۔ قصوری صاحب نے گواہ سے ریٹائر ہونے کے لیے کہا اور عدالت سے کہا کہ اُن کے نزدیک نظر بندی کی احکامات کی جو وجوہ بتائی گئی ہیں حقیقت میں وہ مسٹر بھٹو کی نظر بندی کی بنیاد نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نظر بندی کے اسباب اعلانِ تاشقند سے شروع ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت یہ وجوہ نہیں بتانا چاہتی۔

قصوری صاحب نے مزید کہا کہ حکومت بھارت سے اپنے تعلقات کے تذکرے کے سلسلے میں بھی ذکی الحس ہے۔ عدالت نے قصوری صاحب کو اس سلسلے میں ہوم سیکرٹری سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

ہوم سیکرٹری کو واپس بلایا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ دوسرے ملکوں کی تخصیص نہیں کر سکتے۔ قصوری صاحب نے پوچھا کہ کیا بھارت ان دوسرے ملکوں میں شامل ہے۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا "بھارت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے جتایا کہ صوبے کے مختلف حصّوں میں املاک کے نقصان کے بارے میں جو فہرست پیش کی گئی ہے اُس میں ۷، نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں املاک کی تباہی کے سلسلے میں تذکرہ موجود ہے۔

انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ۷، نومبر ۱۹۶۸ء کو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے باہر جمع ہونے والے طلباء پر لاٹھی چارج کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ سوا تین اور ساڑھے تین بجے سہ پہر کے درمیان ہوا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ انہیں یہ علم نہیں کہ مسٹر بھٹو اس واقعے سے دو یا تین گھنٹے بعد ہوٹل میں آئے تھے۔ انہوں نے مسٹر قصوری کی اس بات سے اتفاق نہ کیا کہ راولپنڈی کے حکام پسند نہیں کرتے تھے کہ

طلبا مسٹر بھٹو کے استقبال کے لیے جمع ہوں۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی کا واقعہ سوا تین اور ساڑھے چار بجے سہ پہر کے درمیان ہوا تھا۔ وہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ میں مسٹر بھٹو کی آمد کا قطعی وقت بتانے سے قاصر رہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ پشاور سے آمد پر طلبا اور دوسرے لوگوں نے مسٹر بھٹو کا استقبال کیا تھا۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ایک طالب علم عبدالحمید پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے قریب پولیس فائرنگ کے نتیجے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس بات سے لاعلمی ظاہر کی کہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے واقعات کا ایک دوسرے سے ربط نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس بات سے بھی آگاہ نہیں ہیں کہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے درمیان تقریباً پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ وہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ املاک کا تمام نقصان ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے مسٹر بھٹو کے ڈیرہ اسماعیل خان کے دورے کے دوران وزیر مال خاں غلام سرور خاں کی وہاں موجودگی سے لاعلمی ظاہر کی۔

۱۰ر جنوری

مسٹر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت کے دوسرے روز درخواست دہندہ کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے صوبائی ہوم سیکرٹری پر جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیگم نصرت بھٹو، مسٹر بھٹو کے تینوں بچے، رشتہ دار، دوست اور رفقاء عدالت میں موجود تھے۔

میاں محمود علی قصوری نے گواہ پر سوال شروع کیے۔

سوال :۔ مسٹر بھٹو کو نظر بند کرنے کے سلسلے میں کب غور کیا گیا تھا؟

جواب :۔ جیسا کہ میں نے کل کہا تھا بعض سیاسی لیڈروں کی سرگرمیوں کے سبب نومبر ۱۹۶۸ء کے آغاز سے امن وامان کی عام صورتِ حال تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ مختلف حکام کے درمیان اجلاسوں اور بات چیت میں یہ معاملہ مسلسل زیرِ غور رہا۔ جہاں تک مسٹر بھٹو کی نظر بندی کا تعلق ہے اس سلسلے میں انسپکٹر جنرل پولیس نے مجھے ایک قطعی تجویز پیش کی تھی۔ گورنر کے نام میرے نوٹ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

سوال :۔ کیا ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء سے قبل مسٹر بھٹو کو گرفتار کرنے کی کوئی تجویز تھی؟

جواب :۔ اُس وقت تک مسٹر بھٹو کو گرفتار کرنے کی کوئی قطعی تجویز نہیں تھی۔

سوال :۔ کیا اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا تھا؟

جواب :۔ میں اس سوال کا پہلے ہی جواب دے چکا ہوں۔

سوال :۔ آپ کو سپیشل برانچ کے مسٹر عبدالقیوم کی رپورٹ کب وصول ہوئی؟

جواب :۔ مسٹر عبدالقیوم اپنی رپورٹ کا مسودہ لے کر ۱۰ر نومبر کی شام کو خود میرے گھر آئے تھے۔ اُس پر اُن کے دستخط نہیں تھے۔ وہ اس مسودے کی ایک نقل مجھے دے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس میں ٹائپ کی بعض معمولی غلطیاں ہیں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آخری رپورٹ اگلے روز صبح دیں گے۔ ۱۱ر نومبر کو تقریباً ڈیڑھ بجے انہوں نے دستخط شدہ آخری رپورٹ بھیج دی۔

سوال :۔ کیا آپ اپنے نوٹ کے دوسرے پیراگراف پر نظر ڈالیں گے اور عدالت کو بتائیں گے کہ جب آپ نے نوٹ لکھا تو آپ کے پاس مسٹر عبدالقیوم کی رپورٹ موجود تھی؟

جواب :۔ اس سوال کا جواب آپ کے پہلے سوال کے جواب میں دے چکا ہوں۔ اُس وقت مسٹر عبدالقیوم کی رپورٹ کے غیر دستخط شدہ مسودے کی نقل میرے پاس تھی لیکن دستخط شدہ نقل مجھے ڈیڑھ بجے موصول ہوئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں دستاویزیں ایک دوسرے سے مماثل تھیں سوائے اس کے کہ آخری اور اصل رپورٹ ”اپ ٹو ڈیٹ“ تھی۔

سوال :۔ کیا رپورٹ میں کوئی تبدیلی کی گئی تھی۔

جواب :۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

سوال :۔ جب آپ نے اپنا نوٹ لکھوایا، کیا آپ کے پاس املاک کے نقصانات کی تفصیلی رپورٹ موجود تھی؟

جواب :۔ جی ہاں۔ میرے نوٹ سے یہی تاثر ملتا ہے۔ میں نے اپنے دفتر کو ہدایت کی تھی کہ نقصانات کے متعلق نوٹ تیار کیا جائے اور اُسے ہر اعتبار سے ”اپ ٹو ڈیٹ“ بنایا جائے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۸ء کے واقعات کی اطلاع پہلے ہی میرے دفتر کو مل چکی تھی اور ۱۱ نومبر کے واقعات کے متعلق تفصیل، جو بعد میں شامل کی گئی، مجھے ٹیلیفون سے آنے والے پیغامات، انفرمیشن برانچ کی رپورٹوں، انسپکٹر جنرل پولیس، کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ذریعے موصول ہوئی تھی۔ ۱۱ نومبر قبل از دوپہر جب میں اپنے نوٹ کا تیسرا پیراگراف لکھوا رہا تھا تو میں نے اپنے دفتر کو ہدایت کی کہ وہ ترسیل کے لیے فائل کی تیاری تک تمام تفصیلات اس میں شامل کرے۔

سوال :۔ کیا یہ فرض کرنا درست ہوگا کہ جب آپ دفتر سے گھر روانہ ہوئے تو مسٹر عبدالقیوم کی رپورٹ آپ کو مل چکی تھی۔

جواب :۔ ہاں یہ فرض کرنا درست ہوگا۔

سوال :۔ کیا آپ مسٹر قیوم کی رپورٹ کا مسودہ پیش کر سکتے ہیں؟
جواب :۔ میں رپورٹ کا مسودہ پیش کرنے سے قاصر ہوں کیوں کہ میں نے اصل رپورٹ موصول ہونے کے بعد تلف کر دیا تھا۔

اس مرحلے پر میاں محمود علی قصوری نے عدالت کو متوجہ کیا کہ اصل رپورٹ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کے پہلے دو صفحات دوبارہ ٹائپ کیے گئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ ہوم سیکرٹری کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہیں کہ مسٹر قیوم کی اصل رپورٹ ۱۱ نومبر کو سوا ایک بجے سہ پہر اُن کے پاس موجود تھی کیونکہ یہ بڑی طویل رپورٹ ہے اور اسے ۱۰ نومبر کی شام اور اگلے روز سوا ایک بجے سہ پہر کے درمیان صحیح لکھوا کر دوبارہ ٹائپ نہیں کرایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹ بعد میں تیار کی گئی ہے۔ اس مرحلے پر مسٹر محمود علی قصوری نے اس بات پر زور دیا کہ اُن کی یہ بات ریکارڈ کی جائے۔ عدالت نے یہ تحریر کرنے کا حکم دیا کہ مسٹر محمود علی قصوری یہ بات ریکارڈ کرانا چاہتے ہیں کہ دو صفحات میں کوئی ایسی عدم مماثلت نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ دوبارہ ٹائپ کیے گئے تھے۔ عدالت نے ان صفحات کو ملاحظہ کیا اور اس سلسلے میں بعد میں رائے ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا۔

سوال :۔ آپ کے دفتر میں مختلف ذرائع سے اطلاعات وصول کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ کیا سیکرٹریٹ میں اطلاعات کی وصولی کا کوئی ریکارڈ ہے۔

جواب :۔ جہاں تک املاک کے نقصان سے متعلق رپورٹ کا تعلق ہے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ کس طریقے سے تیار کی گئی تھی۔ محکمہ داخلہ مختلف ذرائع سے اطلاعات حاصل کرتا ہے۔ چونکہ حالات خراب تھے اس لیے تمام اطلاعاتی اداروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ٹیلیفون کے ذریعے محکمہ داخلہ

کو حالات سے آگاہ کرتے رہیں۔

سوال :۔ کیا آپ سیکرٹریٹ میں اطلاعاتی اور واقعاتی رپورٹوں کا ریکارڈ رکھتے ہیں؟

جواب :۔ عام طور سے موصول ہونے والے کاغذات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ لیکن ٹیلی فون کالوں کا ریکارڈ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں۔

سوال :۔ نقصانات کی فہرست میں ۱۱ نومبر کو مختلف مقامات پر نقصانات کے سلسلے میں کم از کم پندرہ اندراجات ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فہرست زبانی نہیں بلکہ تحریری رپورٹوں کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔

جواب :۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں یہ رپورٹ ٹیلیفون کے ذریعے موصول ہونے والی اطلاعات سے تیار کی گئی تھی۔

سوال :۔ کیا املاک کے نقصان کے بارے میں رپورٹ میں اندراجات کرنے سے قبل ٹیلیفون سے موصول ہونے والی اطلاعات ریکارڈ کی گئیں تھیں؟

جواب :۔ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ باقاعدہ طور پر ریکارڈ کی گئیں تھیں یا نہیں۔

سوال :۔ آپ کے علاوہ کون افسر ٹیلیفون سے آنے والے پیغامات وصول کرتا ہے؟

جواب :۔ میرے ڈپٹی سیکرٹری مسٹر عثمانی اور اس قسم کے دوسرے افسر جو اس وقت موجود ہوں۔

سوال :۔ یقینی طور پر یہ پیغامات نوٹ ہوتے ہوں گے۔

جواب :۔ ٹیلی فون پر ملنے والی اطلاعات کو اختصار سے رف لکھ لیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد پر وہ رپورٹ بنتی ہے جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اطلاعات کے رف نوٹ محفوظ نہیں رکھے جاتے۔

سوال :۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دفتر کو جو پیغامات بھیجے جاتے ہیں

مثلاً گولی چلنے کے واقعات کے بارے میں جن میں بعض افراد ہلاک ہوجائیں اُن کو ریکارڈ نہیں کیا جاتا؟

جواب:۔ ہنگامی حالت میں تمام پیغامات کا ریکارڈ رکھنا ممکن نہیں ہے۔

سوال:۔ املاک کے نقصان کے بارے میں فہرست کس افسر نے تیار کی تھی؟

جواب:۔ محکمہ داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری مسٹر عثمانی نے۔

سوال:۔ کیا آپ کے محکمے کے پاس ڈسپیچ رجسٹر ہے؟

جواب:۔ یقینی طور پر وہاں ڈیسپیچ رجسٹر ہوگا۔ بہرحال میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

سوال:۔ کیا آپ ڈسپیچ رجسٹر کے بارے میں اپنے دفتر سے معلوم کر سکتے ہیں؟

جواب:۔ ہاں۔

عدالت نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ آئندہ سماعت پر اس سلسلے میں جواب دیں۔

سوال:۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بھٹو اکتوبر ۱۹۵۸ء سے جون ۱۹۶۷ء تک مرکزی کابینہ کے وزیر تھے اور اُن کا آخری عہدہ وزیرِ خارجہ کا تھا۔

جواب:۔ ہاں

سوال:۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہیں "ہلال پاکستان" دیا گیا تھا؟

جواب:۔ ہاں

سوال:۔ آپ نے اپنے نوٹ کے ساتویں پیراگراف میں لکھا ہے "موجودہ حکومت کے خلاف منتقمانہ عزائم کی تکمیل کی خاطر" براہ کرم عدالت کے سامنے اس کی وضاحت کیجئے کہ موجودہ حکومت کے خلاف مسٹر بھٹو کیا بغض رکھتے ہیں؟

جواب :- میرا خیال ہے کہ یہ مسٹر بھٹو ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا بغض رکھتے ہیں۔
اس مرحلے پر عدالت نے کہا کہ یہ نوٹ ہوم سیکرٹری نے لکھا ہے اس لیے انہیں اس بات سے آگاہ ہونا چاہیئے کہ موجودہ حکومت کے خلاف وہ کیا بغض ہے جو انہوں نے مسٹر بھٹو سے منسوب کیا ہے۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ یہ تاثر انہوں نے مسٹر بھٹو کی اُن تقریروں سے قائم کیا ہے جو عدالت کے سامنے پیش کردہ ریکارڈ میں شامل ہیں۔

سوال :- ان تقریروں کے علاوہ آپ کے پاس کوئی اور بنیاد نہیں؟

جواب :- نہیں۔

سوال :- آپ نے مسٹر بھٹو کو پریشان کرنے کی ابتدا کب کی تھی۔

جواب :- میں نے مسٹر بھٹو کو پریشان نہیں کیا۔

سوال :- آپ جانتے ہیں کہ حکومت کے نوٹیفکیشنوں کے تحت مسٹر بھٹو کو بعض ہتھیار رکھنے کے سلسلے میں رعائتیں دی گئی تھیں۔ ۱۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو مسٹر بھٹو کے اسلحہ کے لائسنس منسوخ کرنے کے سلسلے میں آپ کے دستخطوں سے ایک نوٹیفکیشن جاری ہوا تھا۔

جواب :- ہاں

سوال :- کیا حکومت اور حکام کا معمول ہے کہ اپوزیشن لیڈروں نے جن مقامات کا دورہ کرنا ہو اور جہاں عام جلسوں سے خطاب کرنا ہو وہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی جائے۔ کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو کے دورے کے دوران اور اس سے تھوڑی دیر پہلے راولپنڈی، پشاور، حیدر آباد، لاہور اور مردان میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی تھی؟

جواب :- یہ معاملہ ریکارڈ سے تعلق رکھتا ہے اور یہ متعلقہ حکام کے پاس موجود

ریکارڈ دیکھ کر اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

سوال :- کیا آپ کو علم ہے کہ مسٹر بھٹو نے گذشتہ سال اکتوبر ۱۹۶۸ء میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا تھا؟

جواب :- میرا خیال ہے کہ اُن کے دورے کے پروگرام کا اعلان کیا گیا تھا۔

سوال :- پشاور میں مسٹر بھٹو کی آمد سے تھوڑی دیر قبل دفعہ ۱۴۴ کے تحت ایک حکم جاری کر دیا گیا تھا؟

جواب :- میں نہیں کہہ سکتا۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ پشاور کے حکام سے معلوم کرنے پر آئندہ سماعت کے موقع پر اس کا جواب دیں۔

سوال :- کیا یہ حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو اکتوبر ۱۹۶۸ء میں پشاور گئے تھے؟

جواب :- ہاں۔

سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ مرکزی وزیر تجارت مسٹر ہوتی نے اعلان کیا تھا کہ جب صدر پشاور آئیں گے تو تین لاکھ افراد اُن کا خیر مقدم کریں گے؟

جواب :- ہو سکتا ہے انہوں نے کہا ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔

سوال :- کیا یہ حقیقت ہے کہ مسٹر ہوتی نے کہا تھا کہ صدر کو پشاور کے عوام کی طرف سے دس لاکھ روپے پیش کیے جائیں گے؟

جواب :- ممکن ہے کہ کہا ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔

سوال :- کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کا پروگرام تھا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو پشاور میں تقریر کریں۔

جواب :- میں نہیں جانتا۔ بہر حال مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے آواخر میں پشاور پہنچے تھے۔

سوال :- کیا آپ مسٹر بھٹو کے جلسے کے بارے میں پشاور کے حکام سے پوچھ کر جواب دے سکتے ہیں۔

جواب :- ہاں -

سوال :- مسٹر بھٹو نے پشاور میں کہا تھا کہ انہیں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے سبب ۲۶ر اکتوبر کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی حالانکہ صدر ۱۰ر نومبر کو جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے ہیں۔ ۲۵ر اکتوبر کو پشاور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی اور ۴ر نومبر کو اُس کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ وہ دفعہ ۱۴۴ کے مذکورہ حکم کی میعاد ختم ہونے کے بعد ۵ر نومبر کو جلسہ منعقد کریں گے اور اگر انہیں اس کی اجازت نہ دی گئی تو وہ ۱۰ر نومبر کو پشاور کے عوام سے خطاب کریں گے، جب صدر صاحب جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے ہیں۔

جواب :- ۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کی سپیشل برانچ کی رپورٹ میں ایک مختصر تقریر مسٹر بھٹو سے منسوب کی گئی ہے جس میں انہوں نے استقبال کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ مختلف مقامات کا دورہ کریں گے اور دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود عوام سے خطاب کریں اور اُن الزامات کا جواب دیں گے جو مسٹر موسیٰ نے اُن پر عاید کیے ہیں۔

سوال :- میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ اگر یہ درست ہوتا تو مسٹر بھٹو پروگرام کے مطابق ۲۶ر اکتوبر کو جلسہ سے خطاب کرتے؟

جواب :- میں ایسا نہیں سمجھتا۔

سوال :- جس رپورٹ کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ آغا محمد علی خاں کی تھی جو لاہور میں تعینات ہیں اور انہوں نے یہیں سے وہ رپورٹ لکھی تھی۔

جواب :۔ یہ رپورٹ پشاور سے ارسال کردہ رپورٹ پر مبنی ہونی چاہیئے۔
سوال :۔ کیا آپ پشاور میں مسٹر بھٹو کی آمد کے متعلق فیلڈ افسر کی رپورٹ پیش کر سکتے ہیں؟

اس مرحلے پر عدالت نے کہا کہ یہ رپورٹ فائل میں نہیں ہے۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ اس سلسلے میں سوال قانون کے تحت فریقین جرح میں اسی دستاویزات کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو دوسری پارٹی کے پاس ہوں لیکن وہ انہیں پیش نہ کرنا چاہتی ہو کیونکہ اس سے اس کا کیس خراب ہوتا ہے۔ فاضل ججوں نے کہا کہ انہیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا اُن دستاویزات کی بنیاد پر نظر بندی کا جواز ہے جو گورنر کے سامنے پیش کی گئی تھیں اور جن پر انہوں نے اپنا حکم جاری کیا۔

سوال :۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو نے دفعہ ۱۴۴ کے حکم کی میعاد ختم ہو جانے کے ایک روز بعد ۵ نومبر کو پشاور میں ایک جلسے سے خطاب کیا اور آپ نے پارٹی کے پہلے اعلان کے مطابق ۲۶ اکتوبر کو جلسہ منعقد نہیں کیا۔

جواب :۔ میں متعلقہ حکام سے پوچھنے کے بعد جواب دے سکتا ہوں۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے کہا کہ وہ ہوم سیکرٹری کو اُن سوالات کی ایک فہرست دیں جن کے جواب دینے کے لیے ہوم سیکرٹری کو متعلقہ حکام سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ عدالت نے ہوم سیکرٹری سے بھی کہا کہ وہ آئندہ سماعت کے موقع پر ضروری معلومات حاصل کر کے آئیں۔

سوال :۔ ۲۶ اکتوبر کو بھٹو صاحب کا چوک یادگار میں جلسہ عام کرنے کا پروگرام تھا لیکن پشاور کے حکام نے انہیں چوک یادگار میں نہیں بلکہ شاہی باغ میں جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دی۔

جواب :۔ میں پشاور سے حکام سے ریکارڈ منگوانے کے بعد اس سوال کا جواب

دوں گا۔

سوال :۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ شیر پاؤ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کنونشن بند کرے میں ہوئی تھی اور پارٹی نے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے سبب شیر پاؤ میں کوئی جلسہ عام بھی منعقد نہیں کیا تھا؟

جواب :۔ میرے پاس تین نومبر ۱۹۶۸ء کو شیر پاؤ میں ہونے والی پیپلز پارٹی کے کنونشن کی رپورٹ موجود ہے میں یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ وہاں کوئی اور جلسۂ عام منعقد ہوا تھا نہیں۔

سوال :۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ دوسری پارٹیوں کو چوک یادگار میں عام جلسے کرنے کی اجازت دی گئی لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کو اجازت نہیں ملی؟

جواب :۔ میں معلوم کروں گا۔

سوال :۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وزیر تجارت نوابزادہ ہوتی نے دفعہ ۱۴۴ کی پابندیوں کے باوجود بدھائی میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا تھا۔

جواب :۔ میں تحقیق کروں گا۔

سوال :۔ براہ کرم اڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ آغا محمد علی خاں کی رپورٹ دیکھیئے اور جواب دیجئے کہ کیا مسٹر بھٹو کے ڈیرہ اسماعیل کے دورے کو ناکام بنانے کے لیے ایک وزیر وہاں بھیجا گیا تھا؟

جواب :۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔

سوال :۔ آپ جانتے ہوں گے کہ وزیر مال غلام سرور خاں مسٹر بھٹو کے دورے سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان گئے تھے اور جب مسٹر بھٹو وہاں پہنچے تو وہ وہیں موجود تھے۔

جواب :۔ مجھے معلوم نہیں کہ غلام سرور خاں مسٹر بھٹو کے دورے کے دوران

وہاں موجود تھے۔

سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے استقبال میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

جواب :- مجھے معلوم نہیں۔

سوال :- کیا مسٹر بھٹو کے دورے کے دوران ڈیرہ اسماعیل خاں میں "غلام سرور مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے تھے۔

جواب :- مجھے علم ہے کہ اس قسم کا نعرہ لگایا گیا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ کیوں؟

سوال :- کیا یہ سچ ہے کہ جب غلام سرور خاں نے مسٹر بھٹو کا استقبال کرنے والے ہجوم میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تو انہیں زدوکوب کیا گیا تھا اور اس واقعہ کی رپورٹ مقامی پولیس میں درج کرائی گئی تھی۔

جواب :- مجھے معلوم نہیں۔

سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ مسٹر بھٹو کے استقبال کے لیے بڑی تعداد میں آرائشی دروازے بنائے گئے تھے جو پولیس نے اکھاڑ دیئے تھے۔

جواب :- میں رپورٹ کا متعلقہ حصہ پڑھ کر سناتا ہوں "پیپلز پارٹی والوں نے جو دروازے استقبالیہ بنائے تھے اور جو بلے کارڈ لگائے تھے پولیس نے انہیں اکھاڑ دیا"۔

سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ غلام سرور خاں ڈیرہ اسماعیل خاں کے موضع پیٹلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جواب :- ہاں۔

سوال :- کیا یہ حقیقت ہے کہ مسٹر غلام سرور خاں کے ایما پر ڈیرہ اسماعیل خان سے بیس میل دور یارک پولیس سٹیشن کے سامنے مسٹر بھٹو کے خلاف کالی جھنڈیوں سے

مظاہرے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جواب :۔ سپیشل برانچ کی ایک رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً بیس پچیس افراد نے جن میں دس جوان اور باقی سکول کے بچے تھے۔ تین چار کالی جھنڈیوں اور ایک پلے کارڈ سے مظاہرہ کیا تھا۔ پلے کارڈ پر" بزدل بھٹو واپس جاؤ" لکھا ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا انتظام کس نے کیا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ یہ مظاہرہ پولیس سٹیشن کے سامنے ہوا تھا۔

سوال :۔ اگرچہ مظاہرے میں بیس پچیس افراد شریک تھے لیکن سرکاری اطلاع میں بتایا گیا تھا کہ دو سو افراد نے مسٹر بھٹو کے خلاف کالی جھنڈیوں سے مظاہرہ کیا۔

قصوری صاحب نے روزنامہ نوائے وقت سے سرکاری ریلیز پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے کہا کہ اس میں جہاں مظاہرہ کرنے والوں کی تعداد بڑھائی گئی ہے وہاں مسٹر بھٹو کا خیر مقدم کرنے والے لوگوں کی تعداد کم بتائی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سپیشل برانچ پولیس کی رپورٹ میں مسٹر بھٹو کا استقبال کرنے والوں کی تعداد ایک جگہ دس ہزار اور دوسری جگہ تین ہزار درج ہے۔ لیکن سرکاری پریس ریلیز میں یہ تعداد صرف ایک ہزار بتائی گئی ہے۔

عدالت نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ پیر ۱۳ر جنوری کو آئندہ سماعت کے موقع پر مذکورہ پریس ریلیز لے کر آئیں۔

۱۳ر جنوری

سماعت کے تیسرے روز درخواست گذار مسز نصرت بھٹو اور اُن کے تینوں بچوں کے علاوہ پیپلز پارٹی کے قائم مقام چیئرمین مسٹر جے۔ اے رحیم بھی عدالت میں موجود تھے۔

مسٹر بھٹو کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔ تاہم وہ خوش وخرم نظر آرہے تھے۔

درخواست دہندہ کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے صوبائی ہوم سیکرٹری مسٹر نبی نور پر جرح جاری رکھنے کے علاوہ دستور کی دفعہ ۹۸ (۲) کے تحت عدالت عالیہ کے اختیارات اور نظر بندی کی وجوہ درست ہونے کے بارے میں عدالتی چھان بین کے متعلق بھی اپنی معروضات پیش کیں۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے کہا کہ وہ اخبارات کے وہ فائل ہوم سیکرٹری کو دے دیں جن کی بنیاد پر طلبا کے ہنگاموں کے بارے میں ہوم سیکرٹری پر جرح کرنا چاہتے ہیں۔

عدالت نے اٹارنی جنرل کو بھی مطلع کیا کہ اگر وہ انکوائری کے دائرہ کے بارے میں مزید دلائل پیش کرنا چاہیں تو عدالت ۴ فروری کو اُن کے دلائل کی سماعت کرے گی۔

درخواست دہندہ کے وکیل نے عدالت کے اختیار کے سوال پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا کہ ہائیکورٹ نظر بندی کے سلسلے میں گورنر کے احکام کے خلاف اپیل کی سماعت نہیں کرتا مطلب محض یہ ہے کہ عدالت کا اختیار صرف اس مواد تک محدود نہیں ہے جو نظر بندی کے احکام جاری کرنے سے قبل گورنر کے سامنے ہوتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ جب تک اپیل کی سماعت کرنے والی عدالت کو قانون نیا مواد طلب کرنے کا اختیار نہ دے اور وہ اسے اختیار نہ دے۔ اور وہ اس اختیار کو استعمال کرنے کا فیصلہ نہ کرے۔ اس کا دائرہ اس ریکارڈ تک محدود ہوتا ہے جو ٹرائل کورٹ کے سامنے ہو۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ پریوی کونسل اور پاکستان اور بھارت کی عدالتوں کے پہلے

فیصلوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ بدنیتی عدالت کے سامنے لائی جا سکتی ہے، اور ثابت کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بدنیتی پر مبنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فعل وہ نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے بلکہ وہ ایسے حالات کا نتیجہ ہے جو لازمی طور پر ریکارڈ میں موجود نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۶۲ء کے آئین سے بھی قبل عدالتیں گورنر کے سامنے موجود ریکارڈ کے علاوہ دوسرے مواد پر بھی غور کر سکتی تھیں۔

انہوں نے کہا کہ مسٹر باقی بلوچ، مسٹر غلام جیلانی اور آغا شورش کاشمیری کے مقدمات میں سپریم کورٹ کے فیصلوں سے ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار میں کمی نہیں بلکہ توسیع ہوئی ہے۔ اگر اس سے پہلے عدالتیں نظر بندی کرنے والی اتھارٹی کے سامنے پیش کردہ دستاویزات کے علاوہ دوسرے مواد پر غور کر سکتی تھیں تو اب بھی کر سکتی ہیں۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ جب سپریم کورٹ یہ کہتی ہے کہ ایک معقول آدمی حکم جاری کر سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ شخص میسر مواد پر غور نہیں کرتا جو اُسے ایک مختلف نتیجے پر پہنچا سکتا ہے تو عدالت کو بھی اُس میسر مواد پر غور نہیں کرنا چاہیئے جس پر متعلقہ اتھارٹی نے غور نہیں کیا۔

درخواست دہندہ کے وکیل نے مزید کہا کہ آئین کی دفعہ ۹۸ (۲) (ب) کے تحت عدالت کو نظر بندی کی قانونی حیثیت اور باقاعدگی کا اطمینان کرنا چاہیئے۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ عدالت کا دائرہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے گورنر کے سامنے پیش کیے گئے مواد تک محدود ہے۔ عدالت کی کارکردگی ایک جوڈیشل عمل ہے اور تمام جوڈیشل عمل کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین کو اپنا موقف ثابت کرنے اور دوسرے کے موقف کو غلط ثابت کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ اگر نظر بند کو اُس مواد تک محدود رکھا جائے جو گورنر کے سامنے پیش کیا گیا ہو تو اس کا اپنا موقف ثابت کرنے کا حق شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عدالت کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا کوئی معقول شخص یہ حکم جاری کر سکتا ہے؟ اسے خود کو اس مواد تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے جو اُس کے سامنے اُس کے ماتحت پیش کریں۔ اگر ایسا ہو تو وہ اپنے ماتحتوں کا مندم بن کر رہ جاتا ہے۔

عدالت نے مسٹر قصوری کے دلائل سننے کے بعد کہا کہ اس سوال پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ضرورت ہے۔ اگر کسی فریق کو عدالت کے حکم پر اطمینان نہ ہو تو وہ سپریم کورٹ سے رجوع کرے گا۔ عدالت عبوری حکم سنانا پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ نظر بند کے مفاد کے منافی ہوگا اور اس سے کارروائی طوالت اختیار کر جائے گی۔

فاضل ججوں نے کہا کہ وہ فی الحال متعلقہ سوال پوچھنے کی اجازت دیں گے لیکن سماعت کے آخری مرحلے پر عدالت کے اختیارات کے دائرے کے بارے میں درخواست دہندہ کے وکیل کے دلائل کی سماعت کریں گے اور اگر عدالت نے یہ محسوس کیا کہ کچھ ایسے مواد کو ریکارڈ پر لایا گیا ہے جسے قانونی طور پر نہیں لایا جا سکتا تھا تو فیصلے کے اس مواد کو پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا۔

ہوم سیکرٹری نے لاہور، راولپنڈی، پشاور، حیدر آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان اور دوسرے مقامات پر دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے بارے میں دستاویز عدالت میں پیش کی۔

سوال:۔ براہِ کرم عدالت کو بتائیے کہ آیا دفعہ ۱۴۴ کے تحت احکامات میں عام جلسے منعقد کرنے، جلوس نکالنے اور لاوڈ سپیکر استعمال کرنے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔

جواب:۔ احکامات کی نقول میرے پاس نہیں ہیں اس لیے میں اُن کا متن بتانے

کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بہرحال اس قسم کے احکامات کے تحت مخصوص وقت پر صورتِ حال کے مطابق عام طور پر عام جلسوں وغیرہ پر پابندی نافذ کی جاتی ہے۔
مسٹر قصوری نے عدالت سے کہا کہ ہوم سیکرٹری سے کہا جائے کہ وہ احکامات کی نقول عدالت کے سامنے پیش کریں۔ عدالت نے ہوم سیکرٹری کو اس سلسلے میں ہدایت کر دی۔

سوال :۔ ڈیرہ اسماعیل خاں اور مردان میں کس بنا پر دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی تھی؟

جواب :۔ میں احکامات پیش کر دوں گا جن میں وجوہ درج کی گئی ہیں۔

سوال :۔ مسٹر بھٹو ستمبر میں پشاور کا دورہ کرنے والے تھے اور انہیں جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روز پشاور میں دفعہ ۱۴۴ اس لیے نافذ کی گئی تھی کہ انہیں وہاں جلسہ عام کرنے سے روکا جا سکے۔ اور اسی لیے مسٹر بھٹو نے اپنا وہ دورہ منسوخ کر دیا تھا۔

جواب :۔ مجھے ذاتی طور پر یہ حکم جاری کرنے کی وجوہ کے بارے میں علم نہیں ہے۔ میں کہنے سے قاصر ہوں کہ مسٹر بھٹو ستمبر ۱۹۶۵ء میں پشاور کا دورہ کرنے والے تھے۔

سوال :۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ آپ کو معلوم ہوا تھا کہ مسٹر بھٹو ۲۶ اکتوبر کو پشاور میں تقریر کرنے کا پروگرام تھا۔

جواب :۔ میں نے ڈپٹی کمشنر پشاور سے معلوم کیا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے منتظمین نے چوک یادگار میں ایک جلسہ عام کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان اجازت لیے بغیر کیا گیا تھا جو دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے دوران ضروری ہوتی ہے۔ بعد میں انہوں نے اجازت مانگی لیکن انکار کر دیا گیا۔
عدالت کے ایک سوال کے جواب میں ہوم سیکرٹری نے بتایا کہ انہوں نے ڈپٹی کمشنر

پشاور سے پوچھا ہے جنہوں نے بتایا ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے تحت جاری کیے گیے حکم میں عام جلسے منعقد کرنے کی اجازت دینے کے بارے میں بھی ایک شق موجود تھی۔

سوال:۔ آیا وزیر تجارت نوابزادہ ہوتی کو دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود ضلع پشاور میں جلسہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

جواب:۔ میں نے اس سلسلے میں پتا کیا ہے کہ مسٹر ہوتی نے حجرہ ارباب محمد خان میں ایک جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ اس کے لیے اجازت مانگی گئی تھی اور ڈپٹی کمشنر نے دے دی تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ بھی بتایا ہے کہ شیر پاؤ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کنونشن میں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

سوال:۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ شیر پاؤ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کنونشن میں لاوڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت کے لیے ایک درخواست دی گئی تھی لیکن وہ رد کر دی گئی تھی اور جلسے کے منتظمین کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا تھا۔

جواب:۔ میں معلوم کرنے کے بعد اس کی تصدیق کر سکوں گا

سوال:۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو کو چوک یادگار میں جلسے کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور انہیں ۵، نومبر ۱۹۶۸ء کو شاہی باغ میں جلسہ منعقد کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

جواب:۔ ڈپٹی کمشنر پشاور نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے منتظمین نے چوک یادگار میں جلسہ کرنے کی اجازت کے لیے درخواست دی تھی لیکن ڈپٹی کمشنر نے انہیں زبانی بتایا تھا کہ چوک یادگار کو آراستہ کیا جا رہا ہے۔ مسٹر بھٹو نے شاہی باغ میں جلسے کے لیے لاوڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کمشنر کو فون کیا تھا۔ انہیں کہا گیا تھا کہ وہ ڈپٹی کمشنر سے بات کریں۔

بعدازاں ڈپٹی کمشنر نے اس بات کی اجازت دے دی تھی جب انہیں اس سلسلے میں ایک درخواست پیش کی گئی تھی۔

سوال :۔ مسٹر بھٹو نے کن مقامات پر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی؟

جواب :۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔

عدالت نے سوال کیا کہ کیا مسٹر بھٹو نے کسی اور جگہ پر بھی دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی یا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی طرف سے اس قسم کی خلاف ورزیاں نظربندی کی وجوہ میں شامل ہیں؟

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ صوبائی وزیر مال غلام سرور خاں کب ڈیرہ اسماعیل خاں گئے تھے؟

جواب :۔ میں نے اُن کے دورے کا پروگرام دیکھا ہے۔ انہیں ۳۱ اکتوبر کو ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچنا تھا اور دو نومبر ۱۹۶۸ء تک وہاں قیام کرنا تھا۔ پھر انہیں ٹونک روانہ ہونا تھا۔

سوال :۔ دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلوس نکالنے کی مخالفت تھی اس کے باوجود خان غلام سرور خاں نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۳۱ اکتوبر اور ۲ نومبر کو جلوسوں کا اہتمام کیا؟

جواب :۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں۔

سوال :۔ کیا آپ نے سرکاری پریس ریلیز کے بارے میں معلوم کیا ہے؟

جواب :۔ میں نے سیکرٹری اطلاعات سے پوچھا ہے۔ یہ پریس ریلیز اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفرمیشن ڈیرہ اسماعیل خاں نے جاری کی تھی۔

مسٹر قصوری نے خاں غلام سرور خاں کی طرف سے دفعہ ۱۴۴ کی پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک جلوس نکلوانے کے سلسلے میں فوائے وقت کی

ایک خبر کا حوالہ دیا اور ہوم سیکرٹری سے ایک سوال پوچھنا چاہا لیکن عدالت نے کہا کہ یہ سرکاری موقف نہیں ہے۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا کہ اگر یہ پاکستان ٹائمز کی رپورٹ ہوتی تو وہ اسے سرکاری موقف سمجھ لیتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان آنے کے بعد سے وہ پاکستان ٹائمز پڑھتے رہے ہیں لیکن اب وہ نوائے وقت بھی پڑھتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو صحیح صورتِ حال سے باخبر رکھ سکیں۔

سوال:- کیا آپ نے ۱۱ نومبر کو ساڑھے آٹھ بجے سے کسی وقت پہلے اپنا نوٹ لکھوانا شروع کیا تھا؟

جواب:- میں نے اپنا نوٹ صبح آٹھ بجے لکھوانا شروع کیا تھا اور ساڑھے دس بجے تک لکھواتا رہا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے میں نے کیس نہیں دیکھا تھا۔

سوال:- آپ کو احساس تھا کہ نوٹ "اپ ٹو ڈیٹ" اور واقعاتی اعتبار سے ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسے ۱۱ نومبر کو ڈیڑھ بجے سہ پہر تک آخری تشکل دی۔

جواب:- میں قدرتی طور پر یہ چاہتا تھا کہ میرا نوٹ اپ ٹو ڈیٹ ہو۔

سوال:- آپ نے ۱۲۹ افراد کو نظر بند کرنے کی سفارش کی لیکن صرف ۱۱۴ افراد کے نظر بندی کے احکام جاری ہوئے۔

جواب:- میں نے تمام ۱۲۹ افراد کی نظر بندی کی سفارش کی تھی۔

سوال:- کیا آپ جانتے تھے کہ اُس وقت مسٹر مسعود نورانی، مسٹر جام ساقی اور مسٹر یوسف تالپور پہلے سے گرفتار کر کے نظر بند کیے جا چکے تھے۔

جواب:- میں یہ نہیں جانتا تھا لیکن میں نے سفارش کی تھی کہ انہیں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کیا جائے تاکہ اگر وہ چھوڑ دیئے جائیں یا مقامی ڈپٹی کمشنر کے

جاری کردہ نظر بندی کے حکم کی معیاد پوری کر کے باہر آجائیں تو اُن کے خلاف ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت کارروائی کی جا سکے کیونکہ میں امن و امان کے مفاد کے پیشِ نظر اُن کی نظر بندی کا خواہش مند تھا۔ گورنر نے اُن کے نام نظر بندی کے حکم میں شامل نہیں کیے غالباً اس لیے کہ یہ لوگ پہلے ہی نظر بند تھے۔

سوال :۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں کراچی کے معراج محمد خاں کا بھی ذکر کیا ہے حالانکہ وہ بھی اُس وقت نظر بند تھے۔

جواب :۔ اس سلسلے میں میرا جواب وہی ہے جو میں نے پہلے سوال کے جواب میں دیا ہے۔

سوال :۔ کسی شخص کو تحفظ امن عامہ کے حکم یا ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا ہو تو کیا ڈپٹی کمشنر اس سلسلے میں گورنر کو رپورٹ بھیجتے ہیں؟

جواب :۔ وہ گورنر کو ضرور رپورٹ بھیجتے ہیں لیکن اس وقت میں یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ متعلقہ افراد کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت یا تحفظ امن عامہ کے قانون کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔

سوال :۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں قوانین کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اختیارات تفویض کر دیئے گئے ہیں۔

جواب :۔ دونوں صورتوں میں انہیں گورنر کو رپورٹ کرنی ہوتی ہے۔

سوال :۔ مسٹر بھٹو کی نظر بندی کی وجوہ میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ لوگوں بالخصوص طلبا کو بھڑکاتے رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں طلبا کا ایجی ٹیشن ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا جب ڈھاکہ میں دو طلبا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اُن دنوں مسٹر نورالامین مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔

اس مرحلے پر عدالت نے کہا کہ حکومت مغربی پاکستان کے ہوم سیکرٹری سے مغربی

پاکستان کے بارے میں سوال پوچھا جائے۔

سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۶۳ء میں طلبا نے لاہور میں جلوس نکالا اور اُن میں سے ۲۲ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جواب :۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں نہیں ہے۔

ہوم سیکرٹری نے عدالت کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ انہوں نے ہوم سیکرٹری کا عہدہ فروری ۱۹۶۷ء میں سنبھالا تھا۔

سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ مارچ ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد میں طلبا کے شدید ہنگامے ہوئے تھے اور حکومت کے بیان کے مطابق جنرل پوسٹ آفس اور ریڈیو پاکستان پر حملہ کیا گیا تھا؟

جواب :۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مارچ ۱۹۶۷ء میں یہ واقعات ہوئے تھے۔

سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جنرل پوسٹ آفس اور ریڈیو پاکستان پر حملہ کیا گیا تھا؟

جواب :۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

سوال :۔ کیا میں آپ کو ۴ مارچ ۱۹۶۷ء کا پریس نوٹ یاد دلا سکتا ہوں؟

مسٹر قصوری نے مذکورہ تاریخ کا پریس نوٹ پاکستان ٹائمز سے پڑھ کر سنایا۔ عدالت نے مسٹر قصوری سے کہا کہ وہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء تک طلبا سے متعلق واقعات کی تاریخیں ہوم سیکرٹری کو دے دیں۔

ہوم سیکرٹری کی درخواست پر مسٹر قصوری انہیں پاکستان ٹائمز کے مختلف تاریخوں کے پرچے مستعار دینے پر رضامند ہو گئے جن کے سلسلے میں اُن سے سوالات پوچھے جانے تھے۔

سوال :۔ آپ نے ۲۱ ستمبر کو حیدرآباد میں مسٹر بھٹو کی تقریر کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس

روز حیدرآباد میں کوئی نقصانات ہوئے تھے تو آپ نے اُن کی تفصیل نہیں دی۔ اگر آپ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے متعلق چارٹ دیکھیں جو آپ نے پیش کیا ہے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اُس تاریخ کو حیدرآباد میں دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں تھی اس کے باوجود پاکستان پیپلز پارٹی کا اجلاس بند کمرے میں ہوا۔

جواب:۔ جیسا کہ ڈائری میں رپورٹ کیا گیا ہے یہ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ زون کی پرائیویٹ کنونشن تھی جو میر رسول بخش تالپور کے باغ کے احاطے میں منعقد ہوئی تھی۔ کنونشن میں شرکت بذریعہ پاس تھی اور اس میں ۲ ہزار افراد شریک ہوئے تھے۔

سوال:۔ اس جلسے میں مسٹر بھٹو نے آئندہ صدارتی انتخابات لڑنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا؟

جواب:۔ ہاں

سوال:۔ آپ نے اس سے پہلے ایک مقدمے میں ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ جلسے کے وقت انتخابات کے پروگرام کا اعلان کیا جا چکا تھا، انتخابی فہرستیں تیار کی جا رہی تھیں اور انتخابی حلقوں کی حد بندی زور شور سے جاری تھی۔

جواب:۔ میں نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ انتخابات کے پروگرام کا اعلان کر دیا گیا ہے، انتخابی حلقوں کی حد بندی کا کام جاری ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یکم دسمبر کو صدر نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ صدر کے عہدے اور دوسرے عہدوں کے لیے انتخابات مقررہ وقت پر ہوں گے۔

سوال:۔ ۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کوہاٹ میں مسٹر بھٹو کی تقریروں کی رپورٹ کس نے تیار کی تھی؟

جواب:۔ یہ رپورٹ سپیشل برانچ کے اے ایس آئی نے تیار کی تھی۔

سوال :۔ کیا آپ اس کا نام جانتے ہیں؟
جواب :۔ نہیں ۔
سوال :۔ اس تقریر پر آپ نے محض یہ اعتراض کیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے صدر ایوب سے کہا تھا کہ وہ اُن کے حق میں حکومت چھوڑ دیں ۔
جواب :۔ قابلِ اعتراض چیز اُن کا انداز اور طریق تھا جس سے وہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے ۔

اس مرحلے پر عدالت کا وقت ختم ہو گیا اور سماعت اگلے روز پر ملتوی ہو گئی ۔

۱۴ر جنوری

بورسٹل جیل میں صبح آٹھ بجے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ۔ کمرۂ عدالت میں مسٹر بھٹو کے دائیں بائیں محمد حنیف رامے اور میر علی احمد تالپور بیٹھے تھے ۔ مسز نصرت بھٹو ، مسز مبشر حسن ، مسٹر جے اے رحیم ، ڈاکٹر مبشر حسن ، مسٹر مصطفےٰ کھر ، مسٹر ممتاز علی بھٹو اور ملک غلام جیلانی بھی تشریف رکھتے تھے ۔

میاں محمود علی قصوری نے ہوم سیکرٹری پر جرح جاری رکھتے ہوئے سوال کیا ۔
کیا آپ کو معلوم ہے کہ لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات پاکستان ٹائمز ، امروز اور مشرق نیشنل پریس ٹرسٹ کے کنٹرول میں ہیں؟
جواب :۔ ہاں ۔
سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کوہستان پاکستان مسلم لیگ کے کنٹرول میں چل رہا ہے؟
جواب :۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا ۔
سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ نوائے وقت ایک آزاد اخبار ہے؟

جواب :- ہاں یہ آزاد اخبار سمجھا جاتا ہے۔
سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ اپوزیشن پارٹیوں کی سرگرمیوں کے متعلق تفصیلی خبریں نوائے وقت میں شائع ہوتی ہیں !
جواب :- نوائے وقت مقابلتہً زیادہ تفصیلات دیتا ہے۔
سوال :- کیا آپ نوائے وقت پڑھتے ہیں ؟
جواب :- میں دوسرے پرچوں کے ساتھ نوائے وقت بھی پڑھتا ہوں۔
سوال :- براہِ کرم ۳۰ر اکتوبر کے شمارے کی سُرخی ملاحظہ کیجئے۔
جواب :- میں ۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کا نوائے وقت کا شمارہ دیکھ رہا ہوں۔ سُرخی میں کہا گیا ہے۔ اپوزیشن آئینی ذرائع سے حکومت تبدیل کرنا چاہتی ہے۔
سوال :- کیا اس میں مسٹر بھٹو کی تقریر شائع کی گئی ہے ؟
جواب :- اس خبر کی ڈیٹ لائن حیدر آباد ہے۔ اور اس میں مسٹر بھٹو کی تقریر شائع کی گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر بھٹو نے کہا :- جب تک آئینی جدوجہد سے موجودہ حکمران طبقے کو تبدیل نہیں کر دیا جاتا میں اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے :- مسٹر بھٹو نے کہا ہم یہ عہد کر کے میدانِ سیاست میں آئے ہیں کہ جو برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف آئینی طریقے سے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ انشاءاللہ انہیں کرسیاں خالی کرنی ہوں گی۔" ہوم سیکرٹری نے کہا، میں اس خبر کے مندرجہ ذیل حصے کا بھی تذکرہ کروں گا

"کارخانہ داروں کو عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے اور مزدوروں کا خون چوسنے کی کھلی چھٹی ہے، گندم کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، چینی نایاب ہے"
سوال :- اس وقت کی خراب صورتِ حال کے سیاق و سباق میں براہِ کرم ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کے نوائے وقت کے شمارے کو ملاحظہ کیجئے اس میں ۔ کی ۲۸ر اکتوبر

کی ڈیٹ لائن سے مسٹر بھٹو کی ایک تقریر کی رپورٹ شائع کی گئی ہے۔

جواب:۔ میں نے اس خبر کے وہ حصے دیکھے ہیں جن کا مسٹر قصوری نے ذکر کیا ہے۔ اور اُن کی خواہش کے مطابق میں خاص طور پر مندرجہ ذیل حصے کا حوالہ دیتا ہوں۔ سابق وزیرِ خارجہ نے یونیورسٹی آرڈیننس اور اعلانِ تاشقند کے خلاف مظاہروں اور پولیس فائرنگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان مظاہروں کے دوران جو لوگ شہید ہوئے ہیں اُن کی یادگاریں تعمیر کی جائیں گی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ہم آئینی ذرائع سے آمریت کو ختم کرنے اور ملک میں جمہوریت کا ملہ کی بحالی کے لیے عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اس مرحلے پر مسٹر قصوری نے کہا کہ قانون یہ ہے کہ ہمیں تقریر کے عام رویے کو دیکھنا ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ نوائے وقت میں چھپی ہوئی خبر جسے لاکھوں افراد نے پڑھا تھا اہمیت رکھتی ہے جب کہ پولیس کے کسی ملازم نے جلسے کے باہر سے جو رپورٹ نوٹ کی ہے وہ اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے کہا کہ مذکورہ تقریر میں مسٹر بھٹو نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اُن کا موقف یہ ہے کہ حکومت کو آئینی طریقوں سے تبدیل کیا جائے۔

عدالت نے کہا کہ یہ کہنا آپ کے لیے نقصان دہ ہوگا کہ "مقرر اس بات کا ذمہ دار نہیں ہے جو اُس نے کہی ہے بلکہ اس کا ذمہ دار ہے جو دوسری ایجنسیوں نے رپورٹ کی ہے۔" عدالت نے مزید کہا کہ اگر اخبار کی رپورٹ کو مدِ نظر رکھنا ہے تو دوسرے اخباروں کے پڑھنے والوں کی تعداد اکیلے "نوائے وقت" سے کہیں زیادہ ہوگی۔

اس مرحلے پر مسٹر قصوری نے کہا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات میں شائع ہونے والی مسٹر بھٹو کی کسی رپورٹ میں یہ نہیں کہا گیا کہ مسٹر بھٹو نے حکومت کو غیر آئینی

طریقوں سے بدلنے کے لیے کہا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ رپورٹروں کو گواہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں لیکن عدالت نے انہیں متوجہ کیا کہ اُنھوں نے اُن پولیس والوں کو گواہ کے طور پر نہیں بلایا جنھوں نے مسٹر بھٹو کی تقریر کی رپورٹ بھیجی تھی۔ عدالت نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے بعض تقریروں میں عوام کو نہ بھڑکایا ہو لیکن بعض دوسری تقریروں میں وہ ایسا کر سکتا ہے۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ قانون کا عام اصول یہ ہے کہ انفرادی واقعات کو انسدادی اقدامات کی بنیاد نہیں بنایا جاتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسٹر بھٹو کی تقریروں کے متن سے یہ ظاہر ہونا چاہیئے کہ وہ اشتعال دلانے کا باعث بنیں۔

بعد ازاں مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے سوال کیا: براہِ کرم ۵ر مارچ ۱۹۶۷ء کے پاکستان ٹائمز کی رپورٹ ملاحظہ کیجیئے۔

جواب:۔ میرے سامنے جو فائل ہے۔ اس کے چودہ ورق ہیں جن پر پاکستان ٹائمز کے مختلف شماروں سے لیے گیے تراشے چسپاں ہیں۔ یہ تراشے سندھ یونیورسٹی کے طلباء اور حیدرآباد کے طلبا کے متعلق ہیں۔ ایک تراشے میں ساٹھ روز بند رہنے کے بعد سندھ یونیورسٹی کے دوبارہ کھلنے کا ذکر ہے۔ ایک تراشہ جون ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد میں طلبا کے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۶۷ء میں پشاور میں طلبا اور پولیس کے درمیان تصادم، جون ۱۹۶۷ء میں لاہور میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف طلبا کے ایک جلوس، جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے طلبا کی ہڑتال، نومبر ۱۹۶۷ء میں ایم اے او کالج لاہور کے طلباء کے ہنگامے، ہڑتال کے سبب گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے بند ہونے، فروری ۱۹۶۸ء میں لاہور میں امریکی دفتر اطلاعات کے سامنے مظاہرے، مارچ ۱۹۶۸ء میں لائل پور میں پانچ طلباء کی گرفتاری اور مئی ۱۹۶۸ء میں کوئٹہ میں طلباء کے تصادم کی خبروں کے تراشے بھی

فائل میں موجود ہیں ۔

اس مرحلے پر عدالت نے مسٹر قصوری کو بتایا کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طلباء ایک ایسا طبقہ ہیں جو فوراً اثر لیتے ہیں۔ آپ غالباً یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ طلباء میں ویسے ہی بے چینی پائی جاتی ہے اور مسٹر بھٹو کی کسی تقریر نے جلتی پر تیل نہیں ڈالا۔ عدالت نے کہا کہ کسی طبقے میں پہلے ہی بے چینی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معمولی سی اشتعال انگیزی بھی خطرناک ثابت ہو گی ۔

سوال :۔ آپ نے ۲ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو شائع ہونے والی صدر صاحب کی تقریر پڑھی اور سنی ہو گی ؟

جواب :۔ ہاں۔

سوال :۔ تقریر کا بیشتر حصہ طلبا کے معاملات کے متعلق تھا ؟

جواب :۔ اس کا ایک حصہ طلبا کے بارے میں ہے ۔

سوال :۔ پاکستان پیپلز پارٹی کب قائم ہوئی تھی ؟

جواب :۔ دسمبر ۱۹۶۷ء

سوال :۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ سی آئی ڈی حیدر آباد نے ۲۵ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو حکومت کی ہدایت پر مسٹر بھٹو کو طلب کیا تھا اور تحفظ امن عامہ آرڈیننس کی دفعہ ۳ کے تحت جاری کیے گئے ایک حکم کے تحت پوچھ گچھ کی تھی ؟

جواب :۔ میں نہیں جانتا۔

سوال :۔ کیا آپ سے مشورہ کیا گیا تھا ؟

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ پاکستان پریس انٹرنیشنل کی ایک خبر کے مطابق صوبائی وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ نے ۳ر مارچ ۱۹۶۸ء کو کہا تھا کہ بھٹو صاحب کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت

نظربند کیا جائے گا۔

جواب :۔ میرے سامنے تین اکتوبر ۱۹۶۸ء کا پاکستان ٹائمز ہے جس میں دوسری باتوں کے مسودہ پر بھی درج ہے کہ وزیر داخلہ نے بھٹو صاحب کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظربند کرنے کے امکان کا بھی ذکر کیا تھا۔

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ پاکستان پریس انٹرنیشنل ایک ایسا ادارہ ہے۔ جسے حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے؟

جواب :۔ مجھے معلوم نہیں کہ اسے حکومت مالی امداد دیتی ہے۔

سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ قاضی فضل اللہ نے کبھی اس رپورٹ کی تردید کی تھی یا نہیں؟

جواب :۔ اگر انہوں نے تردید کی بھی ہو تو میرے علم میں نہیں ہے۔

اس مرحلے پر قصوری صاحب نے بتایا کہ حکومت نے بعد میں اس خبر کے سلسلے میں ایک تردیدی بیان جاری کیا تھا۔

اس پر عدالت نے مندرجہ ذیل بات ریکارڈ کرادی کہ

"مسٹر قصوری کہتے ہیں کہ وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ نے اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی تھی لیکن کچھ عرصے بعد سرکاری طور پر ایک تردیدی بیان جاری کیا گیا تھا۔ یہ تردید مسٹر بھٹو کو نظربند کرنے کی دھمکیوں کے خلاف احتجاج کے بعد کی گئی تھی۔"

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب اور حکومت کے درمیان خاصی مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔ پہلا مقدمہ اسلحہ کے لائسنسوں کی تنسیخ، اور اسلحہ کے سلسلے میں اُن مراعات کو واپس لینے سے متعلق تھا۔ جو ہلالِ پاکستان کے اعزاز کے سبب مسٹر بھٹو کو حاصل تھیں۔

جواب :۔ لائسنسوں کی تنسیخ سے متعلق حکم غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔

سوال :۔ کیا آپ نے لاڑکانہ میں کینیڈی مارکیٹ کے بارے میں سُنا ہے ؟
جواب :۔ میں نے اس کا ذکر سُنا ہے۔
سوال :۔ یہ بھٹو صاحب کی طرف سے جمع کیے گئے فنڈ سے قائم کی گئی تھی۔ اُنہوں نے اس کے لیے ایک ٹرسٹ بھی بنایا تھا اور خود بھی ٹرسٹیوں میں شامل تھے ؟
جواب :۔ مجھے علم نہیں ۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو ٹریکٹروں کے مقدمے میں ملوث کیا گیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف یہ الزام کب عائد کیا گیا؟
جواب :۔ میرا خیال ہے کہ اُن پر اپنی سرکاری حیثیت کے ناجائز استعمال اور محکمہ زراعت سے ایسی مراعات لینے کا الزام تھا جو انہیں نہیں مل سکتی تھیں۔
سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے علاوہ تیس دوسرے افراد ٹریکٹر کیس میں ملوث ہیں ؟
جواب :۔ میں نہیں جانتا۔
سوال :۔ اس مقدمے کی تفتیش کس نے کی تھی ؟
جواب :۔ یہ کام پولیس کی سپیشل پولیس نے انجام دیا تھا۔
سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے اس سلسلے میں ابتدائی رپورٹ کب درج کرائی گئی تھی۔ کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جن افراد پر الزام لگایا گیا اُن میں بھٹو صاحب کے بہت سے ملازم شامل ہیں۔ انہیں گرفتار کر کے ضمانت پر رہا کیا گیا تھا۔ اور تفتیشی افسر مسٹر غلام صدیق قادری ڈی ایس پی تھے۔ جنہیں بعد میں پولیس میڈل دیا گیا۔
سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پولیس بھٹو صاحب کے خلاف ایک اور مقدمے کے سلسلے میں تفتیش کر رہی ہے۔ یہ مقدمہ چاول کی نوڈیرو سے راولپنڈی نقل و حمل

سے متعلق ہے؟

جواب:۔ میں نے ایک اخبار میں خبر پڑھی تھی۔

اس مرحلے پر قصوری صاحب نے کہا کہ مسٹر حفیظ پیرزادہ جو اس مقدمے میں اُن کی مدد کر رہے ہیں۔ بھٹو صاحب کے خلاف دوسرے مقدمات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے انہیں اس سلسلے میں ہوم سیکرٹری سے سوال کرنے کی اجازت دی جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

مسٹر حفیظ پیرزادہ نے ہوم سیکرٹری پر جرح شروع کی:

سوال:۔ بھٹو صاحب کی اراضی کے سلسلے میں بھی ایک مقدمہ ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب مارشل لاء ریگولیشن کے تحت اراضی کے بڑے حصے سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اس کی مارشل لاء کے حکام نے باقاعدہ طور پر جانچ پڑتال کی تھی؟

جواب:۔ انہوں نے یقیناً زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت اپنی اراضی دی ہوگی۔

سوال:۔ اس وقت آپ ڈپٹی کمشنر جیکب آباد تھے؟

جواب:۔ ہاں۔

سوال:۔ بھٹو صاحب کی گڑھی خیرو میں تقریباً ۳۵ تا ۴۰ ہزار ایکڑ اراضی تھی۔ اور انہوں نے زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت اراضی حکومت کو دی تھی۔ کیا آپ نے بھٹو صاحب کی طرف سے دی جانے والی اراضی کے سلسلے میں ایل سی ایک اور ایل سی دو فارموں کی جانچ پڑتال کی تھی؟

جواب:۔ میں نے بھٹو صاحب سے معلوم کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ضلع جیکب آباد میں اُن کی زمین تھی۔ میں نے یقینی طور پر اُن کے فارموں کی جانچ پڑتال کی ہوگی۔

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو اسی قدر اراضی رکھنے کی اجازت دی گئی، جتنی قانون کے مطابق تھی اور جو اُن کی ملکیت تھی۔

جواب :۔ اس بات کو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انہیں اسی قدر اراضی رکھنے کی اجازت دی ہو گی جتنی قانون کے تحت اُن کی ملکیت بنتی تھی۔

اسی مرحلے پر مسٹر پیرزادہ نے درخواست کی کہ اس کیس کے سلسلے میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی کمشنر جیکب آباد سے ریکارڈ طلب کیا جائے۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل کو ہدایت کی کہ وہ ریکارڈ طلب کر لیں اور اگر انہیں کوئی مشکل محسوس ہو تو عدالت کو آگاہ کریں۔

مسٹر محمود علی قصوری نے دوبارہ جرح شروع کی۔

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب کی ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بندی کے بعد لاڑکانہ میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۰ کے تحت ایک ایف آئی آر اور درج کرائی گئی ہے جس میں مسٹر بھٹو کو ملوث کیا گیا ہے۔

جواب :۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔

سوال :۔ میں کہتا ہوں کہ حکومت سے مستعفی ہونے کے بعد جب سے بھٹو صاحب نے حکومت کے خلاف عوام سے خطاب کرنا شروع کیا ہے حکومت اُن کے خون کی پیاسی ہو گئی ہے۔

جواب :۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں۔

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کے خلاف متعدد فوجداری مقدمات قائم کیے گئے ہیں؟

جواب :۔ میں نہیں جانتا۔

سوال :۔ کیا آپ کو کچھ مقدمات کے بارے میں علم ہے۔
جواب :۔ ہاں! مثال کے طور پر بریکٹ والا مقدمہ۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء میں بھٹو صاحب نے گول باغ لاہور میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا تھا؟
جواب :۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے اس قسم کے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔
سوال :۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق یہ مادرِ ملت کے جلسے کے بعد جس سے انہوں نے صدارتی انتخاب کے دوران خطاب کیا تھا لاہور میں سب سے بڑا جلسہ تھا۔
جواب :۔ میں اس جلسے میں شریک افراد کی تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔
سوال :۔ کیا یہ جلسہ درہم برہم کر دیا گیا تھا؟
جواب :۔ جلسے میں گڑبڑ ہوئی تھی۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جلسے میں بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے تھے؟
جواب :۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ جلسہ ہنگامے میں ختم ہو گیا تھا۔
جواب :۔ وہاں گڑبڑ ہوئی تھی۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جلسے میں ایک اینٹ پھینکی گئی تھی جو مسٹر بھٹو کے سر پر لگی تھی جس سے اُن کی پیشانی زخمی ہو گئی تھی۔
جواب :۔ مجھے علم نہیں۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ گڑبڑ پاکستان مسلم لیگ نے کرائی تھی۔
جواب :۔ مجھے علم نہیں۔

سوال :۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ گراونڈ میں پانی چھوڑ دیا گیا تھا۔
جواب :۔ مجھے علم نہیں۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جب بھٹو صاحب حکومت میں تھے تو اُن کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں تھا۔
جواب :۔ مجھے علم نہیں۔
سوال :۔ میں کہتا ہوں کہ بھٹو صاحب کی نظر بندی کا حکم اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد بھٹو صاحب کو آزادی سے محروم کرنا اور لوگوں تک پہنچنے سے روکنا ہے؟
جواب :۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ دو ماہ کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد گرفتار کیے گئے ہیں اور اُن میں سے کسی کو سزا نہیں ہوئی۔
جواب :۔ مجھے اس کا علم نہیں۔
سوال :۔ آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں پاکستان پیپلز پارٹی سندھ زون کی کنونشن میں مسٹر بھٹو کی تقریر کے بعد گورنر حیدرآباد گئے تھے اور دس یا گیارہ اکتوبر کو دربار ہال میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا تھا۔
جواب :۔ گورنر اکتوبر میں حیدرآباد گئے تھے۔

قصوری صاحب نے گورنر کی تقریر کا مکمل متن ہوم سیکرٹری کے سامنے پیش کیا جو پاکستان مسلم لیگ نے شائع کیا تھا۔ ہوم سیکرٹری نے بتایا کہ گورنر کی پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ تقریر ان کے پاس ہے۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بھٹو نے گورنر کی تقریر کا جواب دیا تھا؟

جواب :۔ ہاں انہوں نے جواب دیا تھا۔
سوال :۔ کیا آپ نے ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء کو اپنا نوٹ لکھنے سے پہلے کسی وقت بھٹو صاحب کا جواب پڑھا تھا۔
مسٹر قصوری نے بھٹو صاحب کے جوابی بیان کی ایک نقل ہوم سیکرٹری کو پیش کی اور سوال کیا۔ اس دستاویز کو ملاحظہ کیجئے اور بتائیے کہ جب آپنے نوٹ لکھا، کیا اس وقت یہ جواب آپ کے سامنے تھا۔
جواب :۔ نوائے وقت نے ۲۷ر اکتوبر، ۳۰ر اکتوبر اور ۳۱ر اکتوبر کے شماروں میں بھٹو صاحب کے جواب کا اُردو ترجمہ شائع کیا تھا۔
سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے جنوری ۱۹۶۸ء میں قاسم باغ ملتان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا جس میں بہت سے لوگوں نے تلواریں اور لاٹھیاں لہرائی تھیں۔
جواب :۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ملتان میں ایک جلسے کے بارے میں خبریں پڑھی تھیں جس سے مسٹر بھٹو نے خطاب کیا۔ لیکن میں اس کی تفصیلات نہیں جانتا۔
سوال :۔ کیا لاٹھیوں اور تلواروں سے مسلح آدمیوں نے اس جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی؟
جواب :۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ اس جلسے میں گڑبڑ ہوئی تھی لیکن میں اس کی نوعیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔
سوال :۔ میں کہتا ہوں کہ یہ گڑبڑ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرائی گئی تھی؟
جواب :۔ میں نہیں جانتا۔

سوال:۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس تصادم میں ایک آدمی مارا گیا تھا۔
جواب:۔ معلوم نہیں ہے۔
اس مرحلے پر عدالت نے کارروائی اگلے روز تک کے لیے ملتوی کر دی۔

۱۵ر جنوری

بھٹو صاحب کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت کے پانچویں روز صوبائی ہوم سیکرٹری مسٹر مسعود نبی نور پر جرح مکمل ہو گئی۔ مسٹر بھٹو اور ان کے اہل وعیال کے علاوہ ایر مارشل اصغر خاں اور آغا شورش کاشمیری بھی عدالت میں موجود تھے۔

عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان سے کہا کہ وہ آئندہ سماعت پر بھٹو صاحب کے اراضی کے مقدمے کی فائل عدالت میں پیش کریں۔ اس کے علاوہ عدالت نے صوبائی ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ لاڑکانہ سٹی پولیس سٹیشن میں بھٹو صاحب کے خلاف ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۲۰۷ کے تحت درج کیے گئے مقدمے کی ابتدائی رپورٹ حاصل کریں۔

عدالت نے ہوم سیکرٹری سے یہ بھی کہا کہ وہ محکمہ اطلاعات سے پوچھیں کہ آیا ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو حیدرآباد میں گورنر کی تقریر کا ہینڈ آوٹ جاری کیا گیا تھا۔ اگر ایسا کیا گیا ہو تو آئندہ سماعت پر اس ہینڈ آوٹ کی ایک نقل بھی لائیں۔

ہوم سیکرٹری سے یہ بھی کہا گیا کہ بھٹو صاحب کے خلاف چاول کے مقدمے کے متعلق معلومات حاصل کریں جس کے بارے میں اخبارات میں وزیر داخلہ کا بیان شائع ہوا تھا۔

ہوم سیکرٹری نے لاڑکانہ کے ڈی ایس پی مسٹر غلام صدیق قادری کو دیئے گئے

پاکستان پولیس میڈل کی عبارت بھی عدالت میں پیش کی۔ بھٹو صاحب کے خلاف ٹریکٹروں کے مقدمے کی تفتیش مسٹر قادری نے کی تھی۔

میاں محمود علی قصوری نے ہوم سیکرٹری پر جرح شروع کی۔

سوال :۔ کوہاٹ کی تقریر کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ حکومت اُن کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ بھٹو صاحب نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔ براہِ کرم مذکورہ تقریر کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے اور عدالت کو بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ تقریر کے کس حصے پر انحصار کر رہے ہیں ؟

جواب :۔ میں خاص طور پر مندرجہ ذیل فقرے کا حوالہ دے رہا ہوں "وہ اگر آپ نہیں چھوڑیں گے تو ہم زور سے چھڑائیں گے" یہ فقرہ بھی دیکھئے "میرے پاس پستول نہیں ہے ہم اپنے بھائیوں مزدوروں، طلباء اور کسانوں سے کام لیں گے۔"

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بھٹو نے اب تک کراچی میں کوئی تقریر نہیں کی ؟

جواب :۔ میں اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کر سکتا۔

سوال :۔ مختلف مقامات پر املاک کے نقصان کے سلسلے میں چارٹ پر نظر ڈالیے، اور عدالت کو بتائیے کہ آیا اس میں کسی ایسے واقعے کا ذکر ہے جو بھٹو صاحب کے دورہ شروع کرنے کی تاریخ یعنی ۲۵ اکتوبر اور ۷ نومبر کے درمیان ہوا ہو، جب راولپنڈی میں گولی چلنے کا واقعہ ہوا تھا۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے پوچھا کہ سوال کس طرح مقدمے سے متعلق ہے۔ مسٹر قصوری نے کہا کہ ۲۵ اکتوبر اور ۷ نومبر کے درمیان۔ چارٹ میں صرف اُن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو ڈیرہ اسماعیل خاں، خیر پور اور کیمبل پور میں رونما ہوئے۔ انہوں نے کہا

کہ مسٹر بھٹو نے نہ تو خیر پور اور کیمبل پور کا دورہ کیا اور نہ وہاں تقریریں کیں۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں املاک کے نقصان سے متعلق رپورٹ میں بھی جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھٹو صاحب کے ڈیرہ اسماعیل خاں کے دورے سے قبل ہوئے تھے۔

پھر مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے سوال کیا۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ بھٹو صاحب نے خیر پور یا کیمبل پور میں کبھی تقریر نہیں کی؟

جواب:۔ میں ریکارڈ دیکھے بغیر یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

سوال:۔ میں کہتا ہوں کہ طلباء کے ہنگاموں کا بھٹو صاحب سے بالکل کوئی تعلق نہیں تھا پھر کیا آپ یہ تمام نقصان طلباء سے منسوب کرتے ہیں یا اُن لوگوں سے جنہیں آپ سماج دشمن عناصر کہتے ہیں؟

جواب:۔ دستاویزات میں جن نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا ایک بہت بڑا حصہ طلباء سے متعلق ہے۔

سوال:۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ ان میں سے کون سے نقصانات طلبا سے منسوب کرتے ہیں اور کون سے سماج دشمن عناصر سے؟

جواب:۔ میں تحقیق کروں گا۔

اس مرحلے پر عدالت نے کہا کہ ہوم سیکرٹری کے لیے اس سلسلے میں امتیاز کرنا ممکن نہیں، خصوصاً جب وہ عدالت کے سامنے بیان دے رہے ہیں اور انہوں نے حلف اٹھا رکھا ہے۔

مسٹر قصوری نے کہا کہ صرف راولپنڈی اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے واقعات ایسے ہیں جو بھٹو صاحب کے دورے سے مطابقت رکھتے ہیں جب کہ دوسرے بیشتر واقعات کا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سماج دشمن عناصر کا کام ہوگا جو پولیس کے زیرِ سایہ پھلتے پھولتے ہیں۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے کہا کہ وہ اس بات کو بھٹو صاحب کے حلفیہ بیان میں شامل کر سکتے ہیں جو انہیں پیش کرنا ہے

ہوم سیکرٹری نے اپنے جواب میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی یہ بات کہ دستاویز میں املاک کے جس نقصان کا ذکر کیا گیا ہے اُس کا بڑا حصّہ طالب علموں سے تعلق رکھتا ہے، اُن کے عام تاثر پر مبنی ہے جو انہوں نے قائم کیا ہے۔

سوال:۔ گورنر کے نام اپنے نوٹ میں آپ نے کہا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ طلبا نے ایک طبقے کے طور پر بغاوت کر دی ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ طلباء نے جو تحریک شروع کی تھی سماج دشمن عناصر نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اور وہ آتش زنی لوٹ مار، املاک کے نقصان اور پولیس پر حملوں میں مصروف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ املاک کو طلبا نے نہیں سماج دشمن عناصر نے تباہ کیا۔

عدالت نے یہ سوال مسترد کر دیا۔ عدالت نے کہا کہ یہ معاملہ توضیح سے تعلق رکھتا ہے جو ٹرائل کے دوران آنا چاہیئے۔

سوال:۔ حکومت نے ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی کے واقعہ کے سلسلے میں ایک سرکاری پریس نوٹ جاری کیا تھا۔ یہ ہنگامہ ۷ نومبر کی صبح کو شروع ہوا جب طلبا ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے تھے تاکہ اپنے اس سامان کو واگزار کرا سکیں جو مبینہ طور پر لنڈی کوتل سے لایا گیا تھا اور کسٹم کے حکام نے ضبط کر لیا تھا۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے کہا کہ وہ ہوم سیکرٹری کو اُن پریس نوٹوں اور ریلیزوں کے سلسلے میں ایک چارٹ دے دیں جنہیں وہ عدالت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ عدالت نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ ایسی تردیدیں بھی عدالت میں پیش کر سکتے ہیں جو اخبارات کی رپورٹوں کے سلسلے میں سرکاری طور پر کی گئی ہوں۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے سوال کیا۔

"یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ۷ ، نومبر ۱۹۶۸ء کو پولیس فائرنگ سے راولپنڈی میں ایک طالب علم عبدالحمید ہلاک ہو گیا تھا۔ کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ ۹ ، نومبر کو دو اور آدمی بھی راولپنڈی پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے ان میں سے ایک طالب علم انیس احمد تھا اور دوسرا انٹیلیجنس کا ایک ملازم تھا جو اپنے بیمار باپ کے لیے کھانا لے کر ہسپتال جا رہا تھا۔

جواب :۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ راولپنڈی کی ایک رپورٹ میرے سامنے ہے جو ۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو مجھے بھیجی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پولیس نے مشتعل ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی تھی جس کے نتیجے میں دو افراد موقع پر ہلاک ہو گئے اور چار زخمی ہو گئے۔

سوال :۔ کیا طالب علم انیس احمد انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔

جواب :۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

سوال :۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ راولپنڈی میں پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والا دوسرا آدمی ڈائریکٹریٹ آف انٹیلیجنس کا ایک ملازم تھا ؟

جواب :۔ مجھے علم نہیں۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے بھٹو صاحب کے اسلحہ کے لائسنسوں کی معطلی کی فائل کے سلسلے میں پوچھا جو ابھی عدالت میں پیش نہیں کی گئی۔ عدالت نے ان فائلوں کو آئندہ سماعت پر پیش کرنے کی اجازت دے دی۔

سوال :۔ کیا آپ نے اسلحہ کے لائسنسوں کے سلسلے میں بھٹو صاحب کے حق میں جاری کیے گئے حکم امتناعی کی معطلی کے لیے ایک درخواست دی تھی اور اس میں آپ نے کہا تھا کہ مسٹر بھٹو ایک "ناپسندیدہ آدمی" ہیں۔

اس مرحلے پر عدالت نے بتایا کہ انہوں نے مقدمے کی فائلیں پہلے ہی طلب

کر لی ہیں۔

ایڈووکیٹ جنرل نے سوال کیا کہ اس مقدمے کا ریکارڈ متعلقہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس مقدمے کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے اور درخواست دہندہ کے وکیل کو ریکارڈ مل سکتا ہے۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ فیصلے میں مختلف دستاویزات شامل نہ ہوں جو طلب کی جا رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ رٹ درخواست میں بدنیتی پر مبنی ہونے کا ایک الزام لگایا گیا ہے۔ اس لیے فائلیں طلب کرنا "انتہائی متعلقہ" ہے۔

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ انہیں اس سلسلے میں نوٹس دیئے جائیں۔

بھٹو صاحب کے وکیل مسٹر حفیظ پیرزادہ نے کہا کہ وہ کل یہ کام انجام دے چکے ہیں۔

مسٹر محمود علی قصوری نے ہوم سیکرٹری پر جرح جاری رکھی۔

سوال :- آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے اسلحہ کے لائسنسوں کے سلسلے میں ہائی کورٹ کے حکم کے خلاف سپریم کورٹ میں کوئی اپیل دائر نہیں کی گئی؟

جواب :- میں نے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کراچی سے استفسار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس مقدمے کے سلسلے میں ہائی کورٹ کے خلاف کوئی درخواست دائر نہیں کی گئی۔

سوال :- کیا آپ کو معلوم ہے کہ نظر بندی کے بعد ٹریکٹروں کے کیس کے چالان میں بھٹو صاحب کو مفرور ظاہر کیا گیا ہے؟

جواب :- ڈی آئی جی کرائمز برانچ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مسٹر بھٹو کو چالان میں مفرور درج کیا گیا ہے کیونکہ چالان کے فارم میں اُن کا نام دوسرے دو خانوں (۱) زیر حراست

اور (۲) ضمانت پر۔ میں درج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس مرحلے پر مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا "یہ بڑی زیادتی ہے" انہوں نے مزید کہا کہ جب یہ پتہ تھا کہ مسٹر بھٹو نظر بند ہیں۔ تو چالان میں یہی درج ہونا چاہیئے تھا۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے سوال کیا۔ کیا آپ نے اخبارات میں یہ خبر دیکھی ہے کہ مسٹر بھٹو ایک مفرور ہیں؟

جواب:۔ میرے علم میں نہیں۔

سوال:۔ کیا بھٹو صاحب کے خلاف چاول کے اس مقدمے سے متعلق کاغذات حاصل کر لیے گئے ہیں جس کا قاضی فضل اللہ نے ۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی خبر میں حوالہ دیا تھا۔

جواب:۔ میں نے اس مقدمے کے سلسلے میں ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کو ٹیلیفون کیا تھا انہیں چاول کے اس مقدمے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ پولیس بھی لاڑکانہ میں اس مقدمے کے بارے میں پتہ نہیں چلا سکی۔ ایس پی لاڑکانہ نے تجویز پیش کی ہے کہ اس سلسلے میں راولپنڈی سے پوچھا جائے۔

اس مرحلے پر عدالت نے ہوم سیکرٹری سے پوچھا کہ آیا وزیر داخلہ لاہور میں موجود ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ اسمبلی کے اجلاس کے پیشِ نظر انہیں یہاں ہونا چاہیئے۔

اس پر عدالت نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ وزیرِ داخلہ سے اس مقدمے کے بارے میں پوچھ سکتے تھے۔ انہوں نے ہوم سیکرٹری کو اس مقدمے کے بارے میں وزیرِ داخلہ سے پوچھنے اور بعد میں عدالت کو مطلع کرنے کی اجازت دے دی۔

مسٹر قصوری نے ان سوالات کا ذکر کیا جو بھٹو صاحب کے خلاف اراضی کے

مقدمے کے سلسلے میں کل پوچھے گئے تھے۔ چونکہ اس مقدمے کی فائل میسر نہیں تھی اس لیے اس کے بارے میں جوابات حاصل نہ کیے جا سکے۔

مسٹر قصوری نے کل کے اس سوال کا ذکر کیا جو مسٹر بھٹو کے خلاف ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۳۰۷ کے تحت درج شدہ مقدمے سے متعلق تھا۔

ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ اس سلسلے میں معلومات جمع کی جا رہی ہیں۔

مسٹر حفیظ پیرزادہ نے عدالت کو بتایا کہ انہیں ایف آئی آر کی مصدقہ نقل فراہم نہیں کی گئی۔ اس پر عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان سے کہا کہ وہ ایس پی لاڑکانہ سے کہیں کہ عدالت میں ایف آئی آر کی ایک نقل فراہم کی جائے۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے اس سوال کے بارے میں استفسار کیا، جو انہوں نے ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو حیدر آباد میں گورنر کی تقریر کے بارے میں پوچھا تھا۔

ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ جلسہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں منعقد ہوا تھا۔ حاضرین کو صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ارکان اور ڈویژنل کونسل کے ارکان تک محدود رکھا گیا تھا۔ ہوم سیکرٹری نے روزنامہ پاکستان ٹائمز کے پرچے مہیا کیے جن میں گورنر کی تقریر شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ حکومت نے گورنر کی تقریر شائع نہیں کی۔

ہوم سیکرٹری نے عدالت کے سامنے وہ خبر پیش کی جو وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ کے سلسلے میں تھی اور ۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی تھی۔

مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری سے پوچھا

کیا گورنر نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ملک محمد شریف کی نظر بندی کا حکم جاری کیا تھا؟

جواب:۔ موجودہ فائل میں نظر بندی کے حکم میں چودہ افراد کے نام درج ہیں۔

اس پر مسٹر قصوری نے ہوم سیکرٹری پر جرح ختم کر دی۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے جو فائلیں منگوانے کے لیے کہا ہے۔ اگر اُن کی عدالت کے سامنے پیش ہونے کے بعد ضرورت پڑی تو وہ عدالت سے ہوم سیکرٹری پر مزید سوالات کرنے کی اجازت مانگیں گے۔

عدالت نے مسٹر قصوری سے پوچھا کہ وہ بھٹو صاحب کا حلفیہ بیان کب پیش کر رہے۔ مسٹر قصوری نے کہا یہ اتوار کی شام کو تیار ہو جائے گا۔ اور اس کی نقل اسی شام ایڈووکیٹ جنرل کو دے دی جائے گی۔

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ چونکہ حلفیہ بیان طویل ہوگا۔ اس لیے انہیں اس کا مطالعہ کرنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے۔

عدالت نے اس درخواست پر ۲۳ جنوری تک کے لیے سماعت ملتوی کر دی۔

بیانِ حلفی

بھٹو صاحب کے حلفی بیان کی تیاری میں تاخیر ہو جانے کے سبب رٹ درخواست کی سماعت ۲۳ فروری کو دوبارہ شروع نہ ہو سکی ۔ ۲۴ فروری کو یہ حلفی بیان ہائی کورٹ کے رجسٹرار کو پیش کیا گیا۔ بیان اور دیگر دستاویزات ۱۵۲ صفحات پر مشتمل تھیں۔ ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر کو اس بیان کی نقل ایک روز پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

عدالت نے رٹ درخواست کی سماعت کے لیے ۴ فروری کی تاریخ مقرر کی، تاکہ ایڈووکیٹ جنرل کو مقدمے کی تیاری کرنے کا موقع مل سکے۔

بیانِ حلفی کا متن یہ ہے :-

بخدمت : مغربی پاکستان ہائی کورٹ، لاہور

(رٹ پٹیشن نمبر ۱۶۹۴ بابت ۱۹۶۸ء)

بیگم نصرت بھٹو ——— مدعی بنام حکومتِ مغربی پاکستان ——— مدعا علیہ

پٹیشن کی تائید میں نظر بند مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان :-

میں، ذوالفقار علی بھٹو، خلف مرحوم سر شاہ نواز خاں بھٹو، مسلم، بالغ، ساکن لاڑکانہ، بحال نظر بند بورسٹل جیل لاہور، مغربی پاکستان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ :

(۱) میں مذکورہ بالا رٹ پٹیشن کے مطابق "نظر بند" ہوں جو میری اہلیہ بیگم نصرت بھٹو

'مدعی' نے گورنر مغربی پاکستان کے جاری کردہ میری گرفتاری کے اس حکم کو چیلنج کرتے ہوئے دائر کی ہے جو انہوں نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے رول نمبر ۳۲ کے تحت ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو جاری کیا تھا۔

(۲) میں نے رٹ پٹیشن، مدعا علیہ کی جانب سے داخل کردہ متعلقہ تحریری بیان، نظر بندی کی تائید میں عدالتِ عالیہ کے ریکارڈ پر لائے گئے مواد اور اس عدالت عالی وقار کے سامنے، ہوم سیکرٹری نے جو بیان دیا تھا اس کا مطالعہ کیا ہے۔

(۳) میں نے اپنے دستخطوں سے اس عدالت عالی وقار کی خدمت میں پٹیشن کی تائید میں مزید وجوہ پیش کی ہیں اور میں یہاں تصدیق اور اعادہ کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا مزید وجوہ کے مندرجات درست اور مبنی برحقیقت ہیں اور انہیں اس حلفیہ بیان کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۴) نظر بندی کا مجریہ حکم قانون کے اعتبار سے غلط اور مدعا علیہ کی بدنیتی پر مبنی ہے تاکہ مجھے قانونی استحقاق کے بغیر اور غیر قانونی انداز میں نظر بند رکھا جائے۔ میں اس موقف کی تائید میں اس عدالتِ عالی وقار کی توجہ کے لیے مندرجہ ذیل حقائق اور وجوہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

(۵) میں پُرزور طور پر اُن الزامات کو رَد کرتا ہوں جن پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کا وہ میمورنڈم مشتمل ہے جس میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت میری نظر بندی کی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ الزامات حقائق کے اعتبار سے اتنے ہی بے بنیاد ہیں جتنے مقصد کے اعتبار سے بدنیتی پر مبنی ہیں۔ وہ مغز سے خالی ہیں۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں قانونی لبادے میں پیش کیا جاتا، جو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی بدولت بخوبی میسر آ سکتا تھا۔

میں نے ۲۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو عدالتِ عالی وقار کی خدمت میں جو تائیدی وجوہ پیش کی

تھیں، میں نے ان میں اُن الزامات کو رد کر دیا تھا جو نظر بندی کی اُن وجوہ میں شامل تھے جو مجھے ۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو دی گئی تھیں۔ میں اس موقع پر پورے زور سے اس موقف کا اعادہ کرتا ہوں کہ یہ الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں، بدنیتی پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد غیر دیانت دارانہ ہے۔ میں نے متعدد مقامات پر طویل تقریروں کے دوران جو زبانی بیانات دیئے اور اشارات کیے تھے، انہیں دیدہ دانستہ سیاق وسباق سے جدا کیا گیا ہے بلکہ توڑا مروڑا گیا ہے۔ میں نے امورِ مملکت کے بارے میں کوئی راز افشانی نہیں کی کہ جس سے بیرونی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے روابط پر کوئی حرف آتا ہو۔ نہ ہی میں نے عوام کو خصوصاً طلبار کو برانگیختہ کیا ہے کہ وہ قانون شکنی کریں یا تشدد پر اُتر کر بدنظمی پھیلائیں۔ مثال کے طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ (حکومت کو بدلنے کے لیے) "آخری جھٹکے" کی اصطلاح کا استعمال مجھ سے بالکل غلط اور شر انگیز سیاق سباق میں منسوب کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے یہ اصطلاح آئینی موقف کے دائرے میں رہتے ہوئے استعمال کی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے اُن دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو آئین کے مطابق اس حکومت کے عہد کے باقی رہ گئے۔ مثلاً میں نے لاہور میں ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کے پاس صرف بارہ مہینے اور انیس دن رہ گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے سابق صوبہ سرحد میں تقریروں کے دوران دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کو تبدیل کرنے میں باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے حیدر آباد میں میر رسول بخش تالپور کی کوٹھی کے صحن میں ایک محدود اجتماع سے اڑھائی گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اس کنونشن میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان سے صدارتی انتخاب کے لیے کوئی متفقہ اُمیدوار سامنے نہ آیا اور اگر مغربی پاکستان سے بھی کسی پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو میں خود انتخاب لڑوں گا۔ یہ حقیقت میری اس نیت کی ترجمان ہے کہ میں حکومت کے

کے خلاف آئینی جدوجہد شروع کرنا چاہتا تھا۔

کوہاٹ میں بھی میں نے ایک گھنٹے سے زبانی خطاب کیا۔ نظربندی کی وجوہ میں غلط طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں نے اُس تقریر میں یہ کہا تھا کہ اگر حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بزور اقتدار پر قبضہ کر لوں گا۔ اپنی تقریر میں مَیں نے کہیں بھی اس طرح کا بے سروپا دعویٰ نہیں کیا۔ میری سیاسی سرگرمی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ عوام کی مشترکہ جدوجہد میں شامل ہو کر اُن کے گمشدہ حقوق کی بحالی کے ذریعے پاکستان کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ اگر مجھے اقتدار کی ہوس ہوتی تو میں نے اصولوں پر سمجھوتے بازی کر لی ہوتی اور قید و بند کے مراحل سے گزرنے کے بجائے اپنی مقتدر حیثیت کو قائم رکھا ہوتا۔

مجھے اصرار ہے کہ میں نے ڈیرہ اسماعیل خاں میں جلسۂ عام میں تقریر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنے گرمجوش استقبال پر لوگوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور دفعہ ۱۴۴ فوجداری کے پیش نظر اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ میں نے تقریباً ۵ منٹ تک مختصر تقریر کی تھی۔

لاہور میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سامنے ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء کو میں نے تقریباً چالیس منٹ تک زبانی تقریر کی تھی۔ تقریر کا موضوع خارجہ پالیسی تھا۔ حکومت نے بھارت کو جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیش کش کی تھی اُس سے مضطرب ہو کر میں نے اس پیش کش کے نقصان دہ نتائج کا تجزیہ کیا تھا۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نظربندی کی وجوہ میں میری تقریروں کے تمام ترحوالے سیاق و سباق سے جُدا کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ انہیں بدنیتی سے توڑا مروڑا گیا ہے، ان کی غلط تفسیر کی گئی ہے اور انہیں صحیح روشنی میں پیش نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ تقریروں کی رپورٹیں، جو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شکستہ خط میں لکھی گئی تھیں، زیادہ سے

زیادہ میری طویل تقریروں کے مختصر خلاصے کہلا سکتی ہیں جن میں متعدد فقرے اور الفاظ اس سیاق و سباق میں پیش نہیں کیے گئے جن میں انہیں ادا کیا گیا تھا۔

میں دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ اصل وجوہ جن کی بنا پر مجھے آزادی سے محروم کیا گیا ہے، نہ عاید کردہ الزامات میں اُن کا ذکر ہے اور نہ ان کے مندرجات سے اُن کا کوئی تعلق ہے۔ بلا شُبہ ان وجوہ کا مقدمے سے تعلق ہے۔ لیکن کوئی شرمناک سے شرمناک حکومت بھی انہیں عوام کے سامنے لانے کی شاید ہی جراٴت کر سکتی ہے۔ مگر ان کے وجود سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ وجوہ اُس بدنیتی پر مبنی ہیں جو میرے خلاف حکام کی دھاندلیوں میں جاری وساری ہے اور جس سے الزامات کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔

الزامات میں جو دعوے کیے گئے ہیں ان کا صرف اسی صورت میں کوئی سر پیر ہو سکتا ہے کہ یہ فرض کیا جائے کہ میں نے، میری پارٹی نے یا میرے رفقاء نے حکومت کا بزور تختہ الٹنے کا کوئی منصوبہ، سازش یا پلاٹ بنا رکھا تھا۔ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے رفقاء کے ساتھ مل کر اس طرح کے کسی مقصد یا نیت کے ساتھ کوئی منصوبہ، سازش یا پلاٹ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ حکومت کا ساختہ ہے، اُس کے تصوّر کا کرشمہ ہے، اُس کی خراب وخستہ حالت کا آئینہ دار ہے۔ اپنے عہدِ حکمرانی کے دس سالوں کی تاریکی میں اُسے ہر بات سازش نظر آتی ہے۔

(۹) ملک میں جو عوامی مظاہرے ہو رہے ہیں وہ ایک فرسودہ نظام کے خلاف اظہارِ احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں اور عمومی صورتِ حال کے خلاف ناراضی کے عکاس ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں بلند ہونے والی آوازیں حکومت کی زیادتیوں، اس کی بدعنوانیوں، اُس کے خود غرضانہ مقاصد، انسانی حقوق کے ضمن میں اُس کی تحقیر آمیز پالیسی، اس کے ہاتھوں اداروں کی تباہی، تشدد پیشہ نوکر شاہی پر اس کے انحصار، عوام کی

خدمت میں اس کی ناکامی، ثقافت کے بارے میں اس کی نخوت آمیز روش، عوام سے اس کی حقارت اور کنبہ پروری کے ضمن میں اس کی ہوس ناکی کے خلاف لوگوں کا بے ساختہ قولِ فیصل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس حکومت سے محبت ہے یا میں اس کے اطوار پسند کرتا ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ یہ حکومت کس درجے غیر معقول ہے، بلکہ پاکستان کے لوگ اسے کس درجے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جو بھی گڑبڑ مجھ سے منسوب کی گئی ہے وہ حکومت کے اپنے اعمال — میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی بدعنوانی اور ظلم و تشدد — کا فطری نتیجہ ہے، جن کے باعث عوام کشیدہ خاطر ہو گئے ہیں۔ بے چینی کی وہ لہر جس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے رکھا ہے، اُسی عمومی عدمِ اطمینان کا اظہار ہے جو اربابِ اختیار کے گوناگوں اعمال کے باوجود سطح پر آنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لوگ جبر کے عہد اور اُن بدیوں کے خلاف جنہوں نے حکومت کے طرزِ حکمرانی کے باعث ہمارے معاشرے کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے، احتجاج کرنے کے لیے برسرِ عام نکل آئے ہیں۔ ہمارے عوام دوسرے ملکوں کے عوام سے مختلف نہیں۔ ان کی برداشت کی بھی ایک حد ہے، وہ بھی کسی کا درد محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوّں کی مسرت کے آرزومند ہیں۔ اُن کا افلاس ناقابلِ تصوّر ہے لیکن پھر بھی وہ بہتر مستقبل کے لیے اُمید رکھتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ انہیں مناسب سامانِ زیست، سکونت اور لباس میسّر ہو۔ فاقہ کشی نے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کو اور ابتلاء نے کتنے ہی باپوں کے آنسوؤں کو خشک کر دیا ہے۔ یہ قانونِ خداوندی نہیں کہ ہمارے عوام تاابد مایوس و نامراد رہیں اور اُن کے بچّے بھوک اور بیماری سے مرتے رہیں۔ ہمارے عوام اپنے اور اپنے بچوّں کے لیے بہتر زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں، انہیں خوراک اور لباس کی ضرورت ہے، روزگار اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بے ہنگم خواب نہیں بلکہ وہ توقعات ہیں جو سائنس کے اس شاندار دَور نے ابھاری ہیں۔ اگر عوام کے حقوق سے انکار کیا جائیگا

تو وہ کسی نجات دہندہ کو تلاش کر لیں گے اور اگر نجات دہندہ میسر نہ آیا تو خود اپنی نجات کی راہ نکال لیں گے۔ جب عوام تبدیلی چاہیں تو کسی منصوبے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی عوام کا مزاج ہی منصوبہ ہوا کرتا ہے لیکن بد دماغ حکام جو تاریخ کی رو سے غافل ہوتے ہیں، حکومت کے تواتر کے لیے آخری دم تک ہوس ناکی سے جتن کرتے رہتے ہیں۔

(۷) اگر صورتِ حال وہ نہ ہوتی جو تھی تو میں خواہ کچھ بھی کہتا یا کرتا اس کا امکان نہ تھا کہ عوام کسی طرح بھی متاثر ہوتے۔ معروضی صورت حال یہ ہے کہ عوام جاگ اٹھے ہیں اور از خود آگے بڑھ کر احتجاج کر رہے ہیں۔ کسی سازش یا پلاٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا کوئی منصوبہ ہو جس نے قوم کی اقتصادی اور سماجی بہبود کو متاثر کیا ہو۔ مثال کے طور پر شکر کی نایابی میری پارٹی کے کسی پلاٹ کے باعث پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس نے لوگوں کو غضب ناک کرنے کا ٹھوس نتیجہ ضرور پیدا کیا۔ سنگین اقتصادی بدنظمی اور بدعنوانی کی دوسری مثالوں کے شانہ بشانہ اس کی ذمہ داری بھی خود حکومت پر تھی۔ اقتصادی بدنظمی سیاسی بے چینی کا سب سے مؤثر عنصر ہوتا ہے۔

نوآبادیاتی آقاؤں کا بندھا ٹکا بہانہ ہے کہ جب بھی محکوم عوام اُن کے خلاف اٹھتے ہیں تو وہ ساری گڑبڑ چند سیاسی مظاہرین کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ وہ گولی، پھانسی اور قید کا نسخہ استعمال کرتے رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے قومی بیداری کے سیلاب کے آگے بند باندھ لیں گے۔ انگریز کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اپنے دور میں آزادی کے ہر مطالبے کو چند غیر ذمہ دار مظاہرین کی سازباز قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ حکومت بھی دنیا کو کچھ اسی طرح کی بات کا یقین دلانا چاہتی ہے۔

(۸) تبدیلی کا مظہر جو قانونِ فطرت ہے، معاشرے کے حالات پر منحصر ہے نہ کہ خیالی منصوبوں پر۔ موجودہ نظام ضرور بہت ہی کچا ہے۔ اگر حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ میرے ایک ہفتے کے دورے سے اُس کا سارا ڈھانچہ زمین پر آ رہا ہے۔ لوگوں نے مجھے اس لیے

خوش آمدید نہیں کہا کہ میں تشدّد کا کوئی منصوبہ زیرِ عمل لا رہا تھا، بلکہ اس لیے کہ جب میں نے یہ اعلان کیا کہ رشوت ستانی انتہا کو پہنچ گئی ہے، طالب علموں کو بیڑیاں پہنا دی گئی ہیں، عوام گمراہ رہے ہیں اور حالات ناقابل برداشت ہو چکے ہیں تو میں اُن کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ مائی لارڈز! صدر صاحب کے برعکس جنہوں نے اپریل ۱۹۶۶ء میں ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ہتھیاروں کی زبان استعمال کریں گے، میں نے زبان کا ہتھیار استعمال کیا جو لوگوں تک پہنچنے اور انہیں اُس بہتر مستقبل کی مشترکہ تلاش کے لیے متحد کرنے کا ایک جمہوری ذریعہ ہے جو قانون کی حکمرانی کے مساواتی تصورات پر مبنی ہے۔

مسئلے کی تہ تک جانے کے لیے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھے دھاندلی سے جیل میں اس لیے نہیں ٹھونسا گیا کہ میں نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا بلکہ اس کی وجہ وہ اختلافات ہیں جو میرے اور حکومت کے درمیان جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے۔ اگر نقاب اٹھا دیا جائے تو یہ سوال اُس خلجان کو سلجھا دے گا جو میرے حکومت سے اچانک رخصت ہونے کے ضمن میں پایا جاتا ہے اور میری گرفتاری اور نظربندی کی وضاحت بھی کر دے گا۔ صداقت کو تعصب اور جوڑ توڑ کی گرد سے پاک کر دیا جائے تو یہ اپنی پوری آب و تاب سے میرے اس بیان کے حق میں گواہی دے گی کہ نہ تو میں نے تشدّد کا پرچار کیا اور نہ طلباء کو برانگیختہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا۔ حکومت کے تھکے ماندے چہرے سے انتشار کے آثار ہویدا ہیں۔ بہرحال یہ بیمار ہے یا شاد کام، میں نے بزور اس کا تختہ الٹنے کا منصوبہ نہیں بنایا۔ اس کے برعکس حکومت نے بے دریغ طاقت کا استعمال کیا ہے۔ ہر کہیں معصوموں کے خون نے زمین کو سیراب کیا ہے، کبھی بلوچستان میں اور کبھی مشرقی پاکستان میں، کسی موقع پر پنجاب اور سندھ میں اور کبھی ہمارے شمالی علاقوں کی بستیوں میں۔ انتخابات کے دوران حکومت کے آدمی کراچی کی گلیوں میں

قیصرانی شان و شوکت سے فتح کے جلوس نکالتے رہے ہیں۔
یہ حکومت طاقت سے پیدا ہوئی اور جس استحکام کا بہت ڈھول پیٹا جاتا ہے اس کا انحصار بھی طاقت پر ہے۔ اس نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں طاقت کے استعمال کا یہ جواز پیش کیا کہ ملک کو انتشار سے بچایا جا رہا ہے۔ اور میں یہ پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آج ملک کہاں کھڑا ہے؟ جبر اور بدعنوانی سے حکومت نے ملک کو خاتمے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ اس حکومت نے اپنے سے پہلی حکومت کا تختہ الٹا اور اس کا نام انقلاب رکھ کر انقلاب کے لفظ کی توہین کی ہے۔ یہ ہر سال یوم انقلاب بھی مناتی ہے لیکن ساتھ ہی اگر کوئی اور یہ لفظ منہ سے نکالے تو اُسے سزا دینے میں بھی باک محسوس نہیں کرتی۔

(۹) زیادہ دیر نہیں ہوئی، مغربی پاکستان کے گورنر نے نظامِ حکومت کی جمہوری رُوح کا دفاع کرتے ہوئے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا اور کہا تھا کہ جمہوریت کسی ہاتھی کا نام نہیں ہے جسے لوگوں کے سامنے رکھا جا سکے تاکہ وہ اُسے چھُو کر دیکھیں ہاں مائی لارڈز! جمہوریت واقعی کوئی ہاتھی نہیں لیکن پھر بھی یہ تازہ ہَوا کے جھونکے کی طرح، گُلِ بہار کی خوشبُو کی طرح وجود رکھتی ہے۔ یہ آزادی کا نغمہ ہے جس کا ارتعاش چھُونے سے بھی زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن احساس سے زیادہ جمہوریت کا مطلب ہے بنیادی حقوق، اس کا مطلب ہے بالغ رائے دہی کا حق، ووٹ کی رازداری، آزاد پریس، میل جول کی آزادی، عدلیہ کی آزادی، دستور ساز اداروں کی بالادستی، انتظامیہ پر احتساب اور دیگر متعلقہ کیفیات جو موجودہ حکومت کے نظام میں واضح طور پر غالب ہیں۔ اس حکومت کے طرزِ عمل نے مطبوعہ لفظ کو بے حرمت کر دیا ہے۔ رائے دہی کو ایسے افراد تک محدود کر دیا ہے جنہیں ڈرایا، دھمکایا یا بہلایا پھُسلایا جا سکتا ہے۔ قانون کی عمارت میں من مانی کی دفعات داخل کر دیں، دستور سازی

کو معطل کر دیا، بنیادی حقوق ہیجان انگیز تعطل میں اور میں جوں کے حق کو دفعہ ۱۴۴ کی بھٹی میں ڈال دیا۔ کسی بھی معروضی معیار سے حکومت نے جو کھٹ راگ کھڑا کیا ہے اُسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔

(۱۰) یہ بڑی مایوس کُن حقیقت ہے لیکن اس کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ تشدد کے بغیر تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ جو محدود ذرائع میسّر ہیں ان کے پورے پورے استعمال سے اس حکومت کو بدلا جا سکتا ہے۔ عوام میں تبدیلی کی ایسی بے پناہ لگن ہے کہ ملک کو تشدد کے بغیر تبدیلی کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی طور پر یہ حقیقت ظاہر کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے عوام کو موجودہ حکومت اب مزید قابلِ قبول نہیں اور یہ اُن کا اعتماد کھو چکی ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ حکومت کے اپنے ذاتی مفاد میں ہے کہ وہ خوش دلی سے بروقت رخصت ہو جائے۔ اگر نظامِ حکومت میں عوام کی مرضی کے مثبت اظہار کے لیے کوئی جگہ نہیں تو حکومت کے خلاف ایک منفی فیصلے کو سیاسی طور پر مثبت کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے عوام کی خدمت کے تحت اس صداقت کا اظہار خون خرابے کا پرچار نہیں، یہ خوشامدیوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ کڑوے حقائق سے پردہ شایئں میرا یہ مقام نہیں کہ میں موجودہ خستہ حالی کا عوام سے خطاب کے بغیر علاج کر سکوں۔ صرف حکومت اُس اختیار سے مسلح ہے جس کے ذریعے وہ عوامی مذاکرے کے بغیر تبدیلی لا سکتی ہے۔ اگر حکومت اپنی پالیسیوں کے خلاف مظاہرے نہیں چاہتی تو اس کا علاج خود حکومت کر سکتی ہے۔ حکومت اپنی پالیسیاں بدل سکتی ہے۔ اپنے قوانین کو جمہوری بنا سکتی ہے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے نظامِ حکومت آزادانہ بنا سکتی ہے۔ وہ انصاف کو بروئے کار لا کر اور انسانیت پرور سیاسی اور اقتصادی حالات اُبھار کر قناعت پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن مظاہرے ہو رہے ہیں اور لوگوں میں تلخی ہے کیونکہ یہ حکومت اس کے بالکل برعکس روش پر گامزن ہے اور اپنے جبر کو

"مضبوط مرکز" کا نام دیتی ہے۔

ہوم سیکرٹری نے ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو گورنر مغربی پاکستان کے نام جو مبسوط نوٹ صوبائی نظم و نسق کی عمومی صورتِ حال کے بارے میں لکھا تھا اُس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اصل باعث براہِ راست طلبا نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنھوں نے طلباء کو سیاسی مقاصد کے لیے برانگیختہ اور استعمال کیا۔ میں ہوم سیکرٹری کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے طلباء کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ مائی لارڈز! میں بالکل صاف صاف تسلیم کرتا ہوں کہ گڑبڑ کی ذمہ داری بلاواسطہ یا بالواسطہ طلبا پر نہیں۔ ہمارے طلبا اتنے ہوش مند ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکیں۔ انہیں علم کے حصول کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ مجھے نوجوان نسل پر بے پناہ اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نوخیز مردوں اور عورتوں کی یہ نسل اُن مقاصد میں کامیاب رہے گی جن میں پچھلی نسل ناکام رہی۔ انہیں خدا نے پروازِ تخیل سے نوازا ہے اور آنے والے زمانوں کا بوجھ اٹھانے کی سکت دی ہے۔ نوجوانوں کی اس نسل کا جو دنیا بھر کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے، آسانی سے استحصال نہیں کیا جا سکتا۔ جدید حالات کے بارے میں مطلق جہالت ہی کسی شخص کو یہ راہ دکھا سکتی ہے کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کرے کہ آج کا نوجوان خواہ وہ پاکستان میں ہو یا کہیں اور، سیاسی استحصال کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

مائی لارڈز! میرے پاس کوئی اختیار نہیں کہ میں طلباء کو مادّی فوائد پہنچا سکوں۔ اُن کے لیے محبت اور اعتماد کے سوا میرے پاس ان پر نچھاور کرنے کے لیے سرپرستی کے ذرائع نہیں۔ لیکن حکومت کے پاس ان ذرائع کی کوئی کمی نہیں۔ تمام مادی فوائد جن میں پراپیگنڈے پر کنٹرول بھی شامل ہے حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور پھر بھی اُس نے طلبا کی جمعیت کی ہمدردی گنوا دی ہے۔ حکومت کے برعکس میری تو طلبا تک پہنچ بھی نہیں۔ مجھے اُن کی یونیورسٹیوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ حکومت کی پراپیگنڈہ مشینری کے

پیچھے رات دن میرے خلاف زہر پھیلانے کے لیے متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن طلبا کی جمعیت اتنی روشن ضمیر ہے کہ حکومت اپنی ان نمایاں برتریوں کے باوجود طلبا کو استعمال کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مائی لارڈز! آج کے طلبا ہوشیار ہیں اور انہیں گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت چونکہ طلبا کے طبقے کو سمجھ نہیں سکی اور اس نے انہیں شک کی نظر سے دیکھنا پسند کیا ہے اس لیے اُس کے کارندے یہ نتیجہ نکالنے کی ناقابلِ معافی غلطی کرتے ہیں کہ معاشرے کے یہ پھول اور آنے والے کل کے سربراہ اتنے اناڑی ہیں کہ سیاسی مقاصد کے لیے ان کا استحصال کیا جاسکتا ہے۔

ہوم سیکرٹری نے سیاسی صورتِ حال پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہرحال پاکستان کے طالبعلم کو سیاسی بے چینی کے لدّو جانور کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اصلاح کی پُرزور لگن میں طالبعلم خواہ وہ کہیں بھی ہو، سیاسی مظاہرین کے ہاتھوں استعمال ہونے والا لدّو جانور نہیں بلکہ ترقی کی وہ طاقت ہے جس نے استحصال کے خاتمے کا عزم کررکھا ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک میں طالب علم کا اثر نمایاں ہے۔ وہ معاشرے اور حکومت کی فرسودہ روایات کے خلاف بین الاقوامی مجاہد ہے۔ یہ ہے یونیورسٹی کا وہ طالب علم جسے حکومت ایک گمراہ کھلونا سمجھتی ہے ———— میرے ہاتھوں میں گیلی مٹی کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے۔

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے طالب علموں کو اُکسایا ہے۔ گویا طالب علم پہلے سے بیدار نہ تھے۔ اور یونیورسٹی آرڈی ننس اور دیگر اقدامات کے ذریعے سے جبر و استبداد کا جو طاغوتی نظام ان پر مسلّط کیا گیا تھا اس کے خلاف کھُلے بندوں احتجاج نہ کررہے تھے۔ طالب علم ہمارے معاشرے کا ایک جزُ ہیں اور ایسے اجنبی نہیں جو کسی الگ تھلگ حصّے میں رہتے ہوں۔ یہ فطری امر ہے کہ عام بدحالی اور پاکستانی عوام من حیث المجموع جن ناانصافیوں سے دوچار ہیں اور انہیں آئے دن جس طرح

ہراساں کیا جاتا ہے، طلبہ بھی اُن سے متاثر ہوں۔ اُس جوش و خروش کے باعث جو نوجوانوں کا طرۂ امتیاز ہے انہوں نے نہ صرف اپنی شکایات بلکہ پاکستان بھر کے عوام کے دلوں میں پلنے والی نفرت کا اظہار کیا ہے۔

مجھے اصرار ہے کہ طالب علم کو نہ تو عوام کی مصیبتوں سے اور نہ اہلِ دانش کی مایوسیوں سے علیحدہ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اُس درد انجام معاشرے کا جزو لاینفک ہے جو استحصال کی چکّی میں پس رہا ہے۔ پاکستان کا طالب علم بارہ کروڑ عوام کی آزادیٔ رائے سے محروم خلقت کی دستور ساز اسمبلی ہے۔

(۱۱۳) لیکن اپنے دوسرے ہم کاروں کی طرح ہوم سیکرٹری بھی اُن حد بندیوں کے اندر کام کرتے ہیں جو صداقت سے بَیر رکھتی ہیں۔ سیکرٹری صاحب مجبور ہیں کہ تصویر کو رنگدار شیشوں میں سے دیکھیں۔ وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لوگ ایک پُر زور اور بے ساختہ لہر کی صورت میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ حکومت سے تنگ آ چکے ہیں اور یہ اُن کا غلامی کے خلاف احتجاج کا اظہار ہے۔ ہوم سیکرٹری کا تجزیہ کیونکر یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو اُبھار پایا جاتا ہے وہ چند سیاسی تقریروں سے پیدا نہیں ہُوا بلکہ چینی اور دوائیوں جیسی ضروری اشیاء سے محرومی کے خلاف لوگوں کی اجتماعی ناراضگی کا مظہر ہے۔ یا یہ کہ یہ حکومت کی ناکامیوں کے خلاف عوام کا اُسی طرح کا خود رَو اور بے ساختہ محاسبہ ہے جیسا کہ اُن ملکوں میں عمل میں آ رہا ہے۔ جہاں شخصی آمریت کا دَور دَورہ رہا ہو۔ بلاشبہ ہوم سیکرٹری ایک ایسی رپورٹ پیش کرنے پر مجبور تھے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جناب والا کے سامنے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے شکنجے میں کَس کر پیش کیا گیا ہے کہ مبینہ طور پر میں نے اپنے پیارے وطن کے تحفظ کے خلاف اقدامات کیے ہیں۔ اس وطن کے خلاف جس پر بیرونی جارحیت کے وقت میں نے اس کے دفاع کے لیے ایسے عزم کا ثبوت دیا تھا

کہ مجھے اپنے عوام کی لازوال خوشنودی حاصل ہوئی تھی۔

(۱۳) یونیورسٹی آرڈی ننس میں ترمیم پر راضی ہو کر اور بدعنوانی کے خلاف بعد از وقت اقدامات کرنے پر تیار ہو کر حکومت نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ گڑبڑ کی اصل وجہ لوگوں کی ٹھوس مشکلات تھیں۔ کسی اسلامی تہذیب کے وہ کھاتے پیتے لوگ، جنہیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے دورِ قدیم نے لطافت بخشی ہو، کیونکر اچانک چند تقریروں سے آگ پکڑ کر یک بارگی یوں اُٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں کہ گورنر موسیٰ کے الفاظ میں وہ اس حالت کو پہنچ جائیں کہ ان کی ناقابلِ تسخیر حکومت ایک ہی ہلّے میں دھڑام سے گرنے لگے۔

یہ غیر معمولی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اگر حالات معمول پر ہوتے۔ خود حکومت نے اس بات کا اقرار کیا ہے، کیونکہ اس نے رُسوائے زمانہ یونیورسٹی آرڈی ننس کے ضمن میں طلبا کے بعض منصفانہ مطالبات کو مان کر یہ کوشش کی ہے کہ حالات کچھ نہ کچھ معمول پر آجائیں۔ حالات نے حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ اب وہ ایک حد تک نرم پڑ جائے۔ آرڈی ننس میں مجوزہ ترمیم کے خلاف کوئی ایک آواز بھی سُنائی نہیں دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس بات کا پوری قوم مطالبہ کر رہی ہو وہ اس وقت تک نہ مانی جائے جب تک اُسے زبردستی نہ منوایا جائے۔ اگر یہ اقدامات از خود ضروری تھے تو پھر انہیں اتنے برسوں تک ملتوی رکھنے اور طلبا کے طبقے میں اتنی تلخی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ موجودہ اضطراب ہرگز پیدا نہ ہوتا، اگر استبدادی قوانین کو روزمرّہ قانون کی حیثیت نہ دے دی جاتی۔ یہ بات قومی المیے سے کم نہیں کہ تبدیلیاں لانے کے لیے اتنی زیادہ تلخی کی ضرورت پڑے۔ آرڈی ننس میں جو بربریت مضمر ہے اُس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا پروازِ تخیل کی ضرورت نہیں تھی۔ دنیا بھر میں کہیں بھی، یہاں تک کہ ہٹلر کے عہدِ حکومت میں بھی، یونیورسٹی کی سندیں ضبط نہیں کی گئیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکام پر دس سال کی اندھا دُھند حماقت کے بعد اس ابتدائی حکمت کی وضاحت کے لیے

موجودہ بحران کی ضرورت پڑی جس میں کئی معصوم اور نوخیز طالب علموں کی جانیں گیئں۔ یہ ہیں وہ غلطیاں جنہوں نے لوگوں کو برگشتہ کیا ہے نہ کہ میری تقریروں نے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے کس منطق کی ضرورت ہے کہ کسی ڈگری کی ضبطی، جو دراصل علم کے مترادف ہے، چھینی نہیں جا سکتی، کیونکہ اس کے چھیننے کا مطلب ہے کہ کسی شہری کے دماغ پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کے بجائے خود اپنے آپ کو اُس رسوائی اور تضحیک کا ذمہ دار ٹھرائے جو اس کی غلط کاریوں کی طویل فہرست کے باعث اس کے نام لگی ہیں۔

(۱۴) طلبا کی طرح بقیہ آبادی کا بھی یہی حال ہے۔ مشکلات اس لیے بڑھ گئی ہیں، کہ حکومت لوگوں کی ضروریات سے غفلت برتتی رہی ہے۔ جب تک لوگوں نے مجبور نہیں کر دیا، اس حکومت نے اُن کے جائز مطالبات کے پیش نظر اپنے آپ کوئی ایک بھی رعایت نہیں دی۔ لوگوں کے مفاد کو نظر انداز کر کے اُن کا اعتماد کھو کر یہ حکومت بدنام ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلاؤں جبکہ لوگوں کی نفرت ایک انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف بے چینی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ لوگوں کو جمہوریت سے محروم کر دیا گیا ہے اور اقتصادی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ جموں و کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت پر شکست خوردہ سمجھوتے بازی نے برطانوی سیکرٹری امور خارجہ کے اس بیان کو ممکن بنایا جو اس نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں دیا تھا۔ فرخا بیراج کے بارے میں اسی نوعیت کے متزلزل موقف نے بھارت کو یہ دعوی کرنے کی جرأت دلا دی ہے کہ گنگا بھارتی دریا ہے۔ نظم و نسق تباہ ہو گیا ہے، جرائم کی افراط ہے اور دُکھوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ حضورِ والا، یہ ہیں بحران کی وہ چند علامات جنہیں اُس نوٹ کا جز ہونا چاہیئے تھا جو ہوم سیکرٹری نے گورنر کے نام لکھا تھا۔

اگر ہوم سیکرٹری حکومت کی ڈوبتی ہوئی ساکھ بچانا چاہتے تھے تو انہیں اندھا دھند گرفتاریوں کی سفارش کرنے کی بجائے اپنے آقاؤں کو مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ لوٹ مار کا سدِّباب کرتے، حکمران طبقے کی غارت گری کو برائے خدا روکتے، اس بیڑے میں جوان کے نام پر صوبے کے چار دانگ میں صفیں باندھے کھڑا ہے نئے بسوں کا اضافہ بند کرتے، عام آدمی کے خون پسینے پر مزید فیکٹریاں اور کاروبار نہ کھڑے کرتے اور اپنے نام اور اپنے چہیتوں کو مزید لائسنس جاری کرنے سے باز رہتے۔ اگر آج ملک میں آگ لگی ہوئی ہے تو یہ آگ حکومت کی بداعمالیوں ہی نے بھڑکائی ہے۔

پیراگراف نمبر ۱۵ و ۱۶ حذف کر دیئے گئے

---

(۱۷) ہر شہری کا حق ہے کہ ملک پر حکمران کی کوتاہیوں یا جس نظام کے تحت وہ زندگی بسر کرتا ہے اس پر تنقید کرے۔ یہ بنیادی سیاسی حق ہے، اس کی کارفرمائی کا مطلب ہے کہ لوگ آزاد ہیں اور اس سے محرومی کا مطلب ہے کہ قوم غلام ہے۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے کہ وہ تبدیلیوں کی وکالت کرے خواہ یہ تبدیلیاں بنیادی نوعیت کی ہوں، خواہ ان تبدیلیوں کا تعلق آئین سے ہو خواہ یہ تبدیلیاں معاشرتی نظام سے متعلق ہوں، خواہ یہ معیشت کی تبدیلیاں ہوں۔ اگر تنقید کی اجازت نہ ہو تو کسی طرح کی سیاسی سرگرمی ممکن ہی نہیں۔ تنقید ہر فرد اور ہر سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے۔ حکومت کا طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر اُس تنقید کو جو نشانے پر بیٹھے ڈیفنس آف پاکستان رولز کی خلاف ورزی قرار دیدے۔ ملک کو اُس تنقید سے کوئی خطرہ لاحق نہیں جو بدعنوانی اور جابرانہ قوانین جیسی برائیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔ لوگوں کا امن جبر و استبداد سے تہ و بالا ہوا ہے تنقید سے نہیں۔ جابرانہ قوانین ہی شہری امن کو تہ و بالا کیا کرتے ہیں۔

ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے اُس غیر معمولی قانون کے بے پناہ دائرۂ کار میں جو ایسے

حالات میں زیرِ عمل لایا جا رہا ہے جہاں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں کیونکہ ہم فی الحال کسی بیرونی جارح سے دوچار نہیں۔ قریب قریب ہر اس لفظ یا رو داد کے بارے میں جو سرکاری کانوں پر گراں گزرتی ہو، تشدد پر ابھارنے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے امن امان کا تحفظ برطانفیس بہانہ ہے۔ دس سال کی روز افزوں بدحالی نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اس میں لوگوں کے امن امان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امن و امان کو لوگوں کی فطری مدافعت نے نہیں بلکہ حکام کے ایجنٹوں کے تشدد نے تہ و بالا کیا ہے۔ اس کا الزام مجھ جیسے لوگوں پر تھوپنا جو بنیادی وجوہ کو دور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

(۱۸) میں باضابطہ حکومت میں یقین رکھتا ہوں، طرزِ عمل کے مہذب معیاروں میں یقین رکھتا ہوں، معاشرتی اور اقتصادی انصاف میں یقین رکھتا ہوں، جمہوریت کی صحیح روح میں یقین رکھتا ہوں، عوام کی اُس مسرت میں یقین رکھتا ہوں جو انسانی حقوق سے کامل طور پر بہرہ ور ہونے سے اُبھرتی ہے۔ مجھے علم ہے کہ تشدد کے کیا کیا سرچشمے ہیں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ یہ سرچشمے اُس وقت نہیں پھوٹتے جب لوگ آسودہ حال ہوں۔ دنیا میں بہت کم قومیں ایسی ہوں گی جو اتنی باصبر ہوں، دُکھ اور ناانصافی جھیلنے کی اس قدر برداشت رکھتی ہوں جتنی کہ پاکستانی قوم۔ اُس نے دس طویل برسوں تک اس حکومت کو برداشت کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ دس سال کے اوائل میں حالات اتنے بُرے نہ تھے اور اُمید کی ایک کرن موجود تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات خراب تر ہوتے چلے گئے اور اُمید کی کرن ڈوب گئی۔ اب یہ نوبت ہے کہ عوام حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں۔ تشدد یا عدم تشدد کا اس صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ جانی پہچانی بات ہے کہ پولیس کے ظالمانہ رویے کے سامنے عوام کا ردِ عمل لازمی طور پر تشدد ہی ہوگا۔ ان دنوں اکثر یہ ہوا ہے کہ عوام کو کچوکے دے دے کر انتہا پسندی کی

راہ پر ڈالا گیا ہے۔ ان کے بچوں کو پولیس نے مارا پیٹا ہے، گولیوں کا نشانہ بنایا ہے قتل کیا ہے۔ یہ حقائق ہیں۔ طالب علموں کو شہید کیا گیا ہے۔ میں نے تو پولیس کو نہیں اکسایا تھا کہ طالب علموں کو قتل کرے۔

(۱۹) حکومت طلباء پر میرے اثر و رسوخ کے بارے میں بہت حساس ہے۔ نوجوان لوگ شاید میری جانب اس لیے متوجہ ہوئے تھے کہ میں ان کے مسائل کو سمجھتا ہوں، اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہوں۔ میں اس بات کو کوئی خوفناک غلطی نہیں سمجھتا۔ آخر وہ ہماری آبادی کا جزو لاینفک ہیں، ہماری قوم کا گلِ سرسبد ہیں، ہمارے مستقبل کی امید ہیں۔ حکومت کے پاس ان کے مطالبات کا جواب یہ رہا ہے کہ اُس نے تمام تعلیمی ادارے بند کر رکھے ہیں۔ کسی مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کا یہ عجیب و غریب طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سکول اور کالج ہی نہ ہوں گے تو طالب علم بھی نہ ہوں گے اور پاکستان کی آئندہ نسل ماشاء اللہ ناخواندہ ہو گی۔ اگر عوام کا امن و امان اسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہے، تو یہ امن و امان کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔

(۲۰) میں عرض کرتا ہوں کہ حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ طلباء کے مطالبات مبنی بر حقیقت تھے اور ان میں جان تھی۔ خود صدر صاحب نے بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی آرڈی ننس میں ترمیم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اصل میں انہوں نے مان لیا ہے کہ طلباء کے خلاف حکومت کا جابرانہ اقدام غلط تھا اور طلباء کو بہت بجا شکایات تھیں۔ اگر طلبا اپنی شکایات میں بجا تھے تو پھر میں نے ان کی جو تائید کی تھی وہ بھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اس بات کو صدر صاحب نے اپنی مبینہ "رعایات" کی صورت میں خود تسلیم کیا ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو عید الفطر کے موقع پر قوم کے نام پیغام میں صدر ایوب نے کہا تھا:

"ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیئے کہ غلط فہمیاں، وسوسے، شکوک اور شبہات ہم میں پھوٹ ڈال دیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیں یہ سیکھنا

ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کریں نظریاتی اختلاف کو تلخی اور تشدد میں نہیں ڈھلنا چاہیئے۔"

اگر ان عجیب احساسات کو بروئے عمل لایا جاتا تو یہ اور بھی لائق تحسین بن جاتے۔ لیکن حکومت ان کے برعکس عمل پیرا ہے۔ اس کا وتیرہ طعنہ زنی، الزام تراشی اور گالی گلوچ ہے۔ وہ اپنے کرائے کے غنڈوں کو ملتان کے جلسے میں تلواریں دے کر بھیجتی ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کریں اور اس شہر (لاہور) کے ایک جلسے میں مجھے جسمانی طور پر مجروح کراتی ہے۔ دن دہاڑے، پولیس کی ساز باز سے، وہ قومی شاہراہ پر زبردستی میرا راستہ رکواتی ہے۔ تاکہ کلہاڑیوں سے مجھ پر حملہ کیا جائے اور مسلح ڈاکوؤں کو میرے گاؤں بھیجتی ہے۔ تشدد کی ان خرمستیوں سے بھی اس کا پیٹ نہیں بھرتا تو ملتان کے مسلم لیگیوں کی گورنر مغربی پاکستان کی طرف سے گوشمالی کی جاتی ہے کہ وہ اس علاقے میں میرے دورے کے دوران میری ٹھیک طرح سے خبر کیوں نہ لے سکے۔ اس موقع پر موجود حاضرین میں سے ایک فرد کی بے باکی ملاحظہ ہو کہ اُس نے گورنر کو بتایا کہ اس ضمن میں انہوں نے مجھے جان سے مارنے کے لیے اِدھر اُدھر اپنی سی کوشش کی تھی۔ "ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے" "اور نظریاتی اختلاف کو تلخی اور تشدد میں نہ ڈھلنے دینے" کا یہ بہت نفیس طریقہ ہے۔ اگر ضابطۂ اخلاق واقعی یہی ہوتا تو مجھے محض اس بنا پر نشانۂ ستم کیوں بنایا جاتا کہ مجھے حکومت سے سیاسی اختلافات تھے؟

(۲۱) نااہل حکمران یہ نہیں سمجھتے کہ تاریخ کے ہاتھ کس ڈگر پر بہتے ہیں اس لیے وہ اپنی مشکلات کو اُس فرد کی ریشہ دوانیوں کے سر تھوپ دیتے ہیں جو انہیں سب سے زیادہ ناپسند ہوتا ہے اگر طلبا کوئی مشکل پیدا کریں تو وہ سوچتے ہیں کہ ضرور کوئی نہ کوئی انہیں بھڑکا رہا ہے۔ یہ نوجوان اور خصوصاً طلبا کی خاصیت معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ حالات کو یکسر بدلنے کی خواہش کے اظہار کا تاریخی منصب ادا کرتے ہیں۔ لیکن حکمرانوں کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے

کہ وہ تبدیلی کے امکان کو کھلنے کی توقع میں طلبا کو کچلنے لگتے ہیں ۔حکومت عوام کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ راوی چین لکھتا ہے اور حالات بے حد اچھے ہیں ، بس کچھ "شورش پسند" اور "دنگے باز" ہیں جو "جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کو گمراہ" کرتے رہتے ہیں ۔

(۲۲) حکومت نے مجھے بیہودہ طور پر ہراساں کرنے اور بالآخر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دینے کی جو روش اختیار کی ہے اس کی بناء ان دو حقیقتوں پر ہے :

(الف) اُسے یہ خوف تھا کہ تاشقند کے مسئلے کو پاکستان کے عوام کے سامنے ان کے فیصلے کے لیے لا کھڑا کر دوں گا ۔ اور

(ب) صدر ایوب خاں کو یقین ہے کہ میں صدارت کے ضمن میں ان کا سب سے طاقتور حریف ہوں کیونکہ ان کے برعکس مجھے عوام کا اعتماد حاصل ہے ۔

مجھے محض اس بنا پر اندھا دھند جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے کہ جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند پر حکومت اور میرے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے ۔ میری تقریریں اور اُس وقت کے حالات جیل میں میری نظر بندی کا اصل باعث نہیں ۔ میری نظر بندی کا اصل باعث یہ ہے کہ مجھے اس علم کو عوام تک لانے سے روک دیا جائے کہ اعلانِ تاشقند کیوں اور کیونکر وجود میں آیا ۔ حکومت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ صداقت سے پردہ اٹھا دیا جائے کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو صدر صاحب خواہ جو چاہیں جتن کر لیں کسی صورت بھی تیسری مرتبہ منتخب نہیں ہو سکتے ۔ مجھے جیل میں محبوس کر کے اور یوں سیاسی میدان سے الگ کر کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صدر کے عہدے پر فائز رہنے کا حتمی انتظام کر رہے ہیں ۔ یہ ہے میری نظر بندی کی اصل وجہ نہ کہ نظر بندی کی وجوہ کے میمورنڈم میں درج شدہ وہ الزامات جن کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ۔ میرے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بدنیتی پر مبنی ہیں ۔

(۲۳) میرے اور صدر صاحب کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اور بعد ازیں

اور بالآخر تاشقند میں سنگین اختلافات اُبھر آئے تھے۔ ان غیر معمولی حالات میں جنہیں میری اچھی بھلی صحت کے سر منڈھا گیا جب میں نے حکومت کو خیر باد کہی تو ۱۶ جون ۱۹۶۶ء کی شام کو صدر صاحب نے مجھے اپنے گھر بلوایا۔ شروع شروع میں صدر صاحب خوش گوار رہے۔ میں نے پاکستان کی جو خدمت کی تھی اس پر انہوں نے میری بیحد تعریف کی۔ قدر افزائی کے طور پر انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کیا میں فرانس یا اپنی پسند کے کسی دوسرے ملک میں خصوصی شرائط پر سفارتی عہدہ قبول کر سکوں گا۔ میں نے اس پیش کش کے لیے صدر کا شکریہ ادا کیا لیکن اسے رَد کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک ہنگامہ خیز دَور میں آٹھ سال تک وزیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد قومی زندگی میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے میں اپنی زمینوں پر واپس جانا چاہتا ہوں۔ صدر نے اس خیال کو سراہا اور ازراہِ عنایت تجویز کیا کہ مجھے لاڑکانہ میں چینی یا پٹ سن کا کارخانہ قائم کر لینا چاہیئے۔ وہ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ حکومت اس منصوبے کے ضمن میں ہر سہولت دے گی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر صدر کی عنایت کا شکریہ ادا کیا کہ میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ اپنی سرگرمیوں کو اس پیشے تک محدود رکھوں جس سے میرا خاندان نسل در نسل متعلق رہا ہے۔ اس پر صدر نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ انہوں نے مجھے سختی سے یاد دلایا کہ میں "نازونعمت میں پلنے والا ایک نوجوان ہوں اور میں نے زندگی کے تھپیڑے نہیں سہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ان کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا، وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مجھے واضح طور پر تنبیہ کر دیں کہ اگر پاکستان واپس آکر میں نے سیاست میں حصّہ لیا تو یہ میرے لیے مصیبت کا باعث ہوگا۔ بات کو پوری طرح واضح کرتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر میں نے ان کی دشمنی کو مول لیا تو وہ مجھے "قبر تک نہ چھوڑیں گے"۔ ڈرانے دھمکانے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہوئے میں نے صدر صاحب سے نرمی سے کہا کہ

جہاں تک سیاست میں حصّہ لینے کے بارے میں میرے فیصلے کا تعلق ہے اس کا انحصار قومی مفاد پر ہے نہ کہ دھمکیوں پر ہے۔ یہ غیر مبہم جواب پا کر صدر صاحب اپنے پہلے رویّے کی جانب لوٹ گئے اور انہوں نے تجویز کیا کہ تمام معاملات کو ایک ہی دن چھاننے پھٹکنے کی کوئی جلدی نہیں انہوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی کہ ان امور کے بارے میں یورپ سے واپسی پر بات چیت ہو جائے گی۔

(۲۴) یورپ میں ہمارے بہت سے سفیروں نے مجھے صدر صاحب کی شرائط قبول کرنے کے لیے طرح طرح کی ترغیب انگیز پیش کش کی۔ ان کے کہنے کے مطابق میں بھی اتنا جواں تھا کہ وقتی طور پر سیاست کو بھلا کر بعد از ایوب دور کا انتظار کر سکتا تھا۔ ان کے مشورے نے کئی روپ دھارے۔ مسٹر عبدالرحمٰن خاں جو مغربی جرمنی میں ہمارے سفیر اور صدر صاحب کے برادرِ نسبتی ہیں صُلح صفائی کی کوشش میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ جب میں اکتوبر ۱۹۶۶ء میں واپس آ رہا تھا تو میں کابل میں چند دن رُک گیا۔ میں ابھی وہیں تھا کہ مجھے ڈائریکٹر انٹیلیجینس بیورو، مسٹر ایوب اعوان کی جانب سے پیغام ملا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ راولپنڈی میں قیام کے دوران میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ جب میں پشاور پہنچا تو ڈی۔ آئی۔ جی پولس مسٹر انور آفریدی ہوائی اڈے پر مجھ سے ملے تاکہ تصدیق کریں کہ کیا میں نے مسٹر اعوان کی دعوت قبول کر لی ہے۔ میرے پنڈی پہنچنے کے اگلے دن مرحوم الطاف حسین جو اس وقت وزیرِ صنعت تھے اور جن سے میرے اچھے مراسم تھے مجھ سے ملنے تشریف لائے تاکہ بقول ان کے "دل بہ دل" بات چیت ہو جائے۔ وہ ایک تجویز لے کر آئے تھے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "معقول" ہے اور مجھے قبول کر لینی چاہیئے۔ تجویز یہ تھی کہ میں "خاص رعایت" کے طور پر عملی سیاست میں حصّہ لے سکتا ہوں، بشرطیکہ ایک یا دو چُبھتے ہوئے موضوعات سے گریز کروں اور صاف صاف وعدہ کروں کہ ۱۹۷۰ء میں ذاتی طور پر حصّہ نہیں لوں گا۔ میں نے مسٹر الطاف حسین کو بتایا

کہ انتخابات ابھی دور ہیں اور جس نوعیت کی یقین دہانی وہ مجھ سے چاہتے ہیں انہیں دینے سے قاصر ہوں۔

اسی شام اپنے ڈنر کے دوران مسٹر اعوان کئی ترغیب انگیز تجاویز سامنے لائے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں پاکستان مسلم لیگ میں نمایاں حصہ لیتا رہوں، مجھے اس بات کی آزادی ہوگی کہ میں عوامی سطح پر خارجہ پالیسی پر تعمیری تقریریں کرتا رہوں البتہ جنگ اور تاشقند پر زبان نہ کھولوں۔ ان کے بقول میری حیثیت صدر کے غیر سرکاری مشیر کی سی ہوگی۔ اس طرح مجھے بعض ممالک میں صدر کے سفیر کی حیثیت سے خصوصی مناصب کے لیے دورے کا بھی موقع ملے گا۔ میں نے ڈائریکٹوانٹلی جینس کی تجاویز رد کردیں۔ رخصت ہونے سے قبل مسٹر اعوان نے مجھے تنبیہ کی کہ اس صورت میں مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔

(۲۵) نومبر ۱۹۶۶ء میں، جب صدر صاحب انگلستان میں سرکاری دورے پر تھے، میں ڈھاکے سے واپس آتے ہوئے لاہور میں رکا، مسٹر اختر ایوب جو صدر صاحب کے سب سے بڑے لڑکے ہیں میرے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دوبار مجھ سے ملنے آئے اور صلح صفائی کے لیے وکالت کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس مقصد کے لیے گورنر موسیٰ مجھے دعوت دینے کے آرزومند تھے اور ان سے کہا تھا کہ رسمی طور پر دعوت دینے سے پہلے یہ پتا لگائیں کہ میں اسے قبول کروں گا یا نہیں۔ میں نے مسٹر اختر ایوب سے کہا کہ وہ گورنر موسیٰ سے کہہ دیں کہ وہ اور میں آٹھ سال تک اکٹھے کام کرتے رہے ہیں اور انہیں اس طرح کا تکلف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں گورنر موسیٰ سے ملا اور وہ صدر صاحب کی واپسی پر ان سے "صلح صفائی" کر لینے کی نصیحت کر چکے تو انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تاشقند پر زبان کھولنے

سے احتراز کروں۔ اگر اس بات کو گورنر کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس کی شکل کچھ یوں ہوگی "یہ سب رفت گزشت ہو چکا ہے لہٰذا اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر صدر صاحب بھی انسان ہیں، وہ اس بات کو کیونکر برداشت کر سکتے ہیں" میں نے مسٹر موسیٰ سے کہا کہ میں نے صدر صاحب کے ساتھ خاصی لمبی مدت کام کیا ہے اور بخوبی جانتا ہوں کہ جن لوگوں نے ان کی ناراضگی مول لی ان سے انھوں نے کس طرح کا سلوک کیا لیکن اس کے باوجود بعض امور ایسے ہیں جنہیں قوم سے نہیں چھپایا جا سکتا اور تاشقند بھی ایسا ہی مسئلہ واقع ہوا ہے۔

(۲۶) اگلی پیش قدمی پھر مسٹر اختر ایوب اور ان چھوٹے بھائی طاہر ایوب نے ۱۶ر اپریل ۱۹۶۷ء یا اس سے لگ بھگ کی جب وہ کراچی میں میرے گھر آئے اور سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی۔ جب میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا کہ انہیں اس طرح کی بات کرنے کا آخر اختیار ہی کیا ہے تو انھوں نے پُرزور الفاظ میں بیان کیا کہ اگر انہیں اپنے والد کی منظوری حاصل نہ ہوتی تو وہ میرے گھر آنے اور اس موضوع پر بات کرنے کی جرأت بھی نہ کرتے۔

(۲۷) موجودہ ڈائریکٹر انٹیلی جینس، مسٹر رضوی، نے ان کے تتبع میں مئی ۱۹۶۷ء میں ایک اور کوشش کی جب وہ کراچی میں میرے پاس آئے تاکہ مجھے یہ ذہن نشین کرائیں کہ صدر صاحب کے لیے ۱۹۷۰ء میں تیسری مرتبہ صدر بننا کیوں ضروری ہے۔ ایک ماہ بعد انھوں نے اس نکتے پر مزید زور دیا جب وہ دوبارہ مجھ سے لاہور میں ملے۔ یہ گول باغ کے اُس اجتماعِ عظیم سے میرے خطاب سے ایک روز قبل کا واقعہ ہے جسے میرے تقریر شروع کرنے کے چند منٹ ہی بعد حکومت نے زبردستی تہ و بالا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

(۲۸) ڈور کا سرا ایک مرتبہ پھر مسٹر عبدالرحمٰن خاں، سفیر برائے جرمنی، نے اٹھایا جب میں

اگست ۱۹۶۷ء میں بون گیا۔ ایک سال بعد، مئی ۱۹۶۸ء میں، مسٹر رضوی مجھ سے دوبارہ کراچی میں میری رہائش گاہ پر اسی مقصد کے تحت ملے جو ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے موسمِ گرما کی ملاقاتوں میں مسٹر عبدالرحمٰن خاں کے پیشِ نظر تھا اور جس کے سلسلے میں انہوں نے اگست ۱۹۶۸ء میں بھی اصرار کیا جب بون میں وہ مجھ سے دوبارہ ملے۔

(۲۹) حکومت نے پچھلے اڑھائی سال میں لگاتار جتنی بھی پیش قدمیاں کی ہیں ان کا مرکزی نقطہ یہ طے شدہ کوشش رہی ہے کہ:

(الف) مجھے اس بات سے روکا جائے کہ میں جنگ بندی اور تاشقند کو سیاسی مسئلہ بناؤں۔

(ب) میں صاف صاف یقین دہانی کراؤں کہ میں ۱۹۷۰ء کے صدارتی انتخابات نہیں لڑوں گا۔

جب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ میں پسپائی اختیار نہیں کروں گا تو ساتھ ساتھ ستم کشی کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ بڑھتے بڑھتے ظلم کی حدوں میں داخل ہو گئی۔ وہ واحد ایبڈو زدہ سیاست دان جسے وزیر بنایا گیا ہے، میرے ضلع سے تعلق رکھتا ہے، اُسے امورِ داخلہ کا قلمدان سونپا گیا ہے تاکہ وہ مجھے سرنگوں کرے۔

(۳۰) جس طریقے سے مجھے تختۂ مشقِ ستم بنایا گیا ہے اس کی ہر تفصیل کی فہرست پیش کرنے کے بجائے، عدالت کی سہولت کے لیے میں اُس ستم کشی کی صرف خاص خاص صورتوں پر اکتفا کروں گا جو حکومت نے میرے خلاف روا رکھی ہے:

(الف) میری ذات پر تشدّد آمیز جسمانی حملے۔

(ب) مجھے اور میرے خاندان کو مالکانہ حقوق سے محروم کرنے کی کوششیں۔

(ج) جھوٹے مقدموں میں ملوّث کرنا اور ان کے فیصلوں کے ضمن میں انصاف کے حصول میں مداخلت۔

(د) دیگر ذرائع سے شخصی سطح پر ہراساں کرنا۔
(ہ) میری سیاسی سرگرمیوں میں مداخلت اور میرے سیاسی حامیوں پر ستم کشی۔
(و) میرے دوستوں، عزیزوں اور ملازموں کو ہراساں کرنا۔
(ز) جیل میں عدالت کی تحویل میں ہونے کے باوجود بدسلوکی۔

اب میں مذکورہ بالا عنوانات کے تحت چند واقعات بیان کرتا ہوں۔

الف/١۔ جب میں جون ١٩٦٧ء میں لاہور میں گول باغ کے جلسے سے خطاب کر رہا تھا تو بجلی کے تاروں کو ننگا کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی گراؤنڈ میں پانی چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ جو لوگ وہاں جمع ہوئے تھے انہیں بجلی کے جھٹکے لگیں۔ مختلف اطراف سے خصوصاً ڈائس کی پچھلی جانب سے گملے اور اینٹیں پھینکی گئیں۔ دو اینٹیں میرے سر میں لگیں اور میں زخمی ہو گیا، میرے بائیں کندے پر ایک گملا آ کر لگا۔ جب میں وہاں سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا تو کرایے کے کچھ غنڈوں نے مجھے کانٹے دار تار کی باڑ کی جانب دھکے دیے جس سے مجھے کئی اور زخم آئے۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو اربابِ اختیار نے نظم و ضبط بحال کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کے برعکس پولیس کی وہ بھاری جمعیت جسے جلسہ شروع ہونے سے پہلے وہاں متعین کیا گیا تھا اچانک غائب ہو گئی۔

الف/٢۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد میں نے جنوری ١٩٦٨ء میں ملتان کا دورہ کیا تو میرا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ حکومت نے عزم کر رکھا تھا کہ ملتان ڈویژن میں میرے مشن کی کامیابی کو سبوتاژ کرے گی۔ اپنے اس بداندیش منصوبے کے حصول میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مسلم لیگ کے زعماء کو حرکت میں لایا گیا اور گڑبڑ پھیلانے کے لیے غنڈے کرایے پر لیے گئے۔ پروگرام کے مطابق مجھے ملتان کے چیدہ چیدہ شہریوں سے "شیزان" ہوٹل میں خطاب کرنا تھا۔ پولیس کی حفاظت میں جو غنڈے وہاں جلسے کو درہم برہم کرنے کے حکم کے تحت بھیجے گئے تھے، وہ آدھ گھنٹے تک پتھراؤ اور اینٹیں پھینکتے

رہے۔ وہ خنجروں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ ہوٹل کو اچھا خاصا نقصان پہنچا۔ پولیس نے اس وقت تک مداخلت نہ کی جب تک کہ اس بڑے ہجوم نے جو مجھے خوش آمدید کہنے جمع ہوگیا تھا ان غنڈوں کو بھگانے کے لیے بیچ میں مداخلت نہ کی۔

الف۔ اگلے دن مجھے خانیوال بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنا تھا۔ اپنے حامیوں کے ہمراہ میں ملتان سے صبح صبح روانہ ہوا۔ راستے میں قادر پور روان کے مقام پر کرائے کے پچیس غنڈوں نے ہماری موٹروں کو زبردستی روک لیا۔ وہ کلہاڑیوں اور چاقوؤں سے مسلح تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار بدنیتی سے مجھ پر لہرائے۔ اُنھوں نے ہماری چار پانچ کاروں کے ٹائر پھاڑ دیے۔ جب میں مجبوراً اپنی کار سے باہر نکلا تو میں نے قریب ہی کنسٹیبلوں کی معیت میں ایک پولیس انسپکٹر کو کھڑے دیکھا۔ انھوں نے مسلح لٹیروں کو قابو کرنے کی کوشش نہ کی۔ حملہ آوروں سے ہمیں بچانے کے سلسلے میں اُن کی بے پروائی پر انہیں شرم دلا کر میں نے اپنی کار تبدیل کی اور ایک طویل راستے سے بصد مشکل خانیوال پہنچا۔

الف تیسرے روز مجھے قاسم باغ کے جلسۂ عام سے خطاب کرنا تھا جسے حکومت درہم برہم کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ چنانچہ حکومت کے زرخریدوں اور تنخواہ داروں کو مختلف مقامات پر متعین کر دیا گیا تھا کہ اس جلسے کو درہم برہم کرسکیں جو ملتان کی تاریخ میں ایک عظیم ترین اجتماع تھا۔ ایک جتھا قلعے کے اس دروازے کو روکنے کے لیے متعین کیا گیا تھا جو جلسہ گاہ پر کھلتا تھا۔ جب اس بات کا پتا چلا تو میرے حامی مجھے اس راستے کے بجائے پیچھے سے ایک خلا میں سے گزار کر سٹیج پر لے آئے۔ جب دروازے پر متعین کرایہ داروں کو پتا چلا کہ میں سٹیج پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہوں تو انھوں نے ہجوم پر لاٹھیاں برسانی شروع کردیں۔ ہجوم نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی مجھے بولتے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس جتھے نے جسے

ہجوم کے درمیان متعین کیا گیا تھا لوگوں کو لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کیا تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔ جب یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تو تیسرا جتھا، جس کی قیادت ملتان کا ایک بدنام غنڈہ کر رہا تھا، اور جسے سٹیج سے قریب متعین کیا گیا تھا تلواریں، خنجر اور چاقو لہراتا ہوا لوگوں کو ڈرانے دھمکانے لگا۔ تلواریں سونتے ہوئے یہ جتھا قدم بہ قدم میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے دو نے، جو میرے بالکل پاس پہنچ گئے تھے، مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اب میرا خاتمہ قریب آ گیا ہے اور میں اس جگہ سے زندہ بچ کر نہ جاؤں گا۔ مجھے مجمع عظیم کے اس حصے نے بچایا جس نے ان غنڈوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا جب کہ وہ مجھ سے صرف چند قدم پر رہ گئے تھے۔ اس جھڑپ میں نہ صرف ہجوم کے متعدد شرکاء، بلکہ "چند کرایہ دار" بھی بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ انتظامیہ کی بالائی سطح جو ڈی آئی جی، ڈی سی، ایس پی اور دوسروں پر مشتمل تھی، اس نے اس گڑبڑ کا قلعے کے ایک مقام نظر سے تماشا کیا لیکن مداخلت کی ضرورت نہ سمجھی۔ جب لوگوں نے انتشار پسندوں پر قابو پا لیا تو پولیس پھرتی سے حرکت میں آ گئی مگر محض اس لیے کہ زخمی "کرایہ داروں" کو اٹھا لے جائے اور جلد از جلد ہسپتال میں داخل کرا دے۔ جو لوگ ہجوم میں سے زخمی ہوئے تھے نہ تو پولیس نے اُن کی کوئی مدد کی اور نہ انہیں ہسپتال میں داخلہ ملا۔

الف۔ آٹھ ماہ قبل کچھ اجنبی میرے گاؤں میں آوارہ گردی کرتے دیکھے گئے۔ انہیں مشتبہ پاکر بعض گاؤں والے ان کے پیچھے لگ گئے یہاں تک کہ وہ چائے کی ایک دکان میں جا پہنچے۔ جب ان لوگوں نے میرے گھر کا ایک نقشہ میز پر بچھایا تو ان کا تعاقب کرنے والے افراد ان پر جھپٹ پڑے اور گھر کا نقشہ چھین لیا، ساتھ ہی وہ دستی بم اور پستول بھی چھین لیے جن سے یہ لوگ مسلح تھے۔ وہ انہیں تھانے لے گئے، جہاں انہیں اور اس تمام اسلحے کو جو اُن سے چھینا گیا تھا حوالۂ پولیس کر دیا گیا۔ بظاہر

اپنے افسروں کی ہدایات پر تھانے دار نے ان سب لوگوں کو رہا کر دیا۔ یہ واقعہ اخبار "کمنٹ" میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ابھی تک اس کی تردید نہیں کی گئی۔

ب ۱ - میں اور میرا خاندان زرعی اصلاحات کے تحت اپنی بہت سی زرعی املاک سے دستکش ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وزیرِ داخلہ کی شہ پر مجھے ہراساں کرنے کے لیے بعض لوگوں کی جھوٹی درخواست پر بار بار تفتیش کرائی جاتی ہے تاکہ میرے نابالغ بچوں کو ان کی زرعی املاک سے محروم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں لاڑکانہ کے تین ڈپٹی کلکٹروں نے چار مختلف موقعوں پر تفتیش کی ہے اور الزامات کو بے بنیاد پایا ہے۔ ان کے نتیجۂ تحقیقات کے باوجود ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ اور کمشنر خیرپور نے بار بار اصرار کیا ہے کہ از سرِ نو تفتیش کی جائے۔ اگرچہ یہ تفتیشات ہماری املاک سے متعلق ہیں اور عدالت ہائے مال کے زیرِ اہتمام انجام پائی ہیں جن میں وکلا پیش ہوئے ہیں، بیانات درج ہوئے ہیں، گواہوں پر جرح ہوئی ہے اور دستاویزوں کی جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ لیکن عدالت کے نتیجۂ تحقیقات کی نقول ہمیں مہیا کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ یہی نہیں، محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے طور پر الگ اس مسئلے کی تفتیش کرائے ــــ کسی مبینہ طور پر ستم زدہ کی طرف سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر نہیں، بلکہ لاڑکانہ میں حیدر آباد کے ایک پولیس انسپکٹر کی جانب سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر۔ وزیرِ داخلہ نے بار بار یہ سرِ عام کہا ہے کہ میں نے غریب مزارعین کی زمین غصب کر لی ہے حالانکہ یہ بات اُن حقائق کے منافی ہے جن کی تصدیق عدالت ہائے مال کے نتیجۂ تحقیقات سے اور زرعی اصلاحات کی نظامت کے احکامات سے ہوتی ہے۔ یہ اقدام اس دہرے مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ مجھے بدنام کیا جائے۔ اور حصولِ انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جائے۔

ب ۲ - اپریل ۱۹۶۸ء میں لاہور اور حیدر آباد کے بیسیوں سرکاری افسروں کو لاڑکانہ

میں اس کام پر متعین کیا گیا کہ وہ میرے پورے خاندان کی جس میں میرے سب چچا اور چچیرے بھائی بہن بھی شامل ہیں املاک سے متعلقہ ریکارڈ اور دستاویزیں حاصل کرلیں جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہمیں ہماری املاک سے محروم کرنے کے ذرائع ڈھونڈے اور راہیں تراشی جائیں۔

۲ب۔ جب تک حکومت نے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں چاول کی نقل و حمل پر پابندیاں نہ لگادیں پالیسی یہ تھی کہ خریداری کی حد پوری ہونے کے بعد چاول کی فروخت کے پرمٹ جاری کر دیے جاتے تھے۔ سوائے ان معدودے چند موقعوں کے جب حکومت کو فوری ضرورت پڑ گئی۔ ہماری ۱۹۶۷ء کی فصل نہ تو خریدی گئی اور نہ اس کی فروخت کے لیے پرمٹ جاری کیا گیا۔ ہماری آمدنی کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ ہمیں شدید مالی مشکلات کا خطرہ لاحق ہوگیا یہاں تک کہ حکومت نے عام پالیسی کے طور پر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں چاول کی نقل و حمل سے پابندیاں اٹھالیں۔

۴ب۔ حکومت پاکستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے اُن اعلانات کو منسوخ کرتے ہوئے جن کے تحت مجھے اسلحہ رکھنے کے ضمن میں لائسنسوں کی ضرورت نہیں تھی یک طرفہ کاروائی کی۔ اس کاروائی کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے حکم دیا کہ میرا تمام لائسنس یافتہ اسلحہ ضبط کرلیا جائے۔ یہ حکم ہلال پاکستان کے ایوارڈ کے دائرے میں آنے والے ہتھیاروں پر بھی حاوی تھا بلکہ سجاوٹی ہتھیاروں اور ان قدیم ہتھیاروں پر جو آرمز آرڈیننس کی زد میں نہ آتے تھے۔ کراچی ہائی کورٹ نے حکومت کی اس تمام تر کاروائی کو غیر قانونی قرار دیا تھا۔ جیسا کہ عدالت عالی وقار نے قرار دیا۔ ہوم سیکرٹریٹ نے غیر قانونی احکام جاری کیے تھے جو اسلحہ ضبط کرلینے کے مترادف تھے۔ جب یہ معاملہ ہائی کورٹ میں زیر غور تھا تو اس دوران میں بھی ایک درخواست کے ذریعے جسے ہوم سیکرٹری کے حلفیہ بیان کی تائید حاصل تھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ حالتِ موجودہ کی منسوخی کا حکم

حاصل کر لیا جائے تاکہ حکومت عدالت عالی وقار کے فیصلے سے قبل ہی میرے ہتھیار چھین لے۔ یہی نہیں بلکہ جب ہائی کورٹ نے حالتِ موجودہ قائم رکھنے کا حکم دے دیا تب بھی ڈی ایس، پی مسٹر قادری جو ٹریکٹروں کے مقدمے کے انچارج تھے، میرے گھر آئے اور انہوں نے اتنی بے باکی کا مظاہرہ کیا کہ مجھے حکم دیا کہ میں اپنے تمام ہتھیار اُن کے حوالے کر دوں۔

ج ۔ حکومت نے مجھے یکے بعد دیگرے مختلف مقدمات میں ملوث کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ان مقدمات کی پیروی اور عذر داری میں اس قدر الجھا دیا جائے کہ میں ان سیاسی امور پر توجہ مرکوز نہ کر سکوں جنہیں ملک میں اوّلین حیثیت حاصل ہے۔

ج/۱ ۔ ٹریکٹروں کا بدنام مقدمہ کھڑا کرنا بھی میرے ساتھ حکومت کی بدنیتی کو بے نقاب کرنے کے ضمن میں ایک متعلقہ شہادت ہے۔ اس مقدمے کے چند انوکھے پہلو جو کراچی ہائی کورٹ کی جانچ پڑتال اور غور و فکر سے گزر چکے ہیں اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہنے دیتے کہ حکومت میری سیاسی تباہی کے لیے آخری حد تک بھی جائے گی۔ میرے بارے میں صریح دھوکے باز اور جعل سازی کا معین ہونے کے جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب میری ناچیز قومی خدمات کے اعتراف میں مجھے ہلالِ پاکستان کے اعلیٰ سول ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اور بعد میں نے جو کوششیں کی تھیں انہیں پوری قوم نے سراہا تھا جس میں پاکستان کے صدر محمد ایوب خاں اور پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس اے۔ آر کارنیلیس بھی شامل ہیں۔ اس مقدمے میں جو سرکاری ملازمین وعدہ معاف گواہ بن گئے ہیں انہیں نہ صرف ملازمت پر بحال رکھا گیا بلکہ انہیں ترقی دے دی گئی۔ اگرچہ یہ مقدمہ اگست ۱۹۶۷ء میں ایک بالکل اجنبی شخص کی جانب سے گورنر مغربی پاکستان کے نام

براہِ راست شکایت کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا لیکن یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ مقدمے کے ضمن میں چارج شیٹ یکم نومبر ۱۹۶۸ء کو جاری کی گئی۔ عدالت نے ۱۵ نومبر کو پہلی پیشی مقرر فرمائی تھی اور قانونی طور پر مجھے حاضر عدالت ہونا تھا لیکن ۱۳ نومبر کو گرفتاری کے باعث معذور تھا۔ بعدازیں عدالت کی جانب سے ۱۴ دسمبر کو حاضری کے وارنٹ جاری ہونے کے باوجود حکومت نے عدالت کے اس حکم کی تعمیل کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ اس کے برعکس ساہیوال جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے دیدہ دانستہ اس وارنٹ کی خلاف ورزی کی۔

چارج شیٹ میں مجھے مفرور بیان کیا گیا تھا حالانکہ اس وقت میرے محلِ وجود کے بارے میں اچھا بھلا علم تھا اور اس کا خوب چرچا کیا جا چکا تھا۔ حاضری کے وارنٹ کی دیدہ دانستہ خلاف ورزی کے علاوہ حکومت بیہودہ باتوں پر التواء کی درخواستیں پیش کرتی رہتی ہے۔ ایک پیشی پر ڈی۔ ایس۔ پی مسٹر قادری نے یہ درخواست گزاری تھی، کہ مقدمے کو سکھر سے لاڑکانہ منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ تمام تر گواہ اور ملزمین لاڑکانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے اُلٹ ۱۳ جنوری ۱۹۶۹ء کو حکومت نے ایک اور درخواست گذاری۔ جس میں ان ۲۹ ملزمین کی سہولت کو یکسر نظرانداز کر کے جو کبھی اپنے ماحول سے باہر نہیں آئے۔ یہ چاہا گیا کہ مقدمے کو سیدھا لاہور منتقل کر دیا جائے۔

جب ابتداءً اگست ۱۹۶۷ء میں ایف آئی آر دائر کی گئی تو ملزموں میں سے بعض لوگوں کی ضمانت قبل از گرفتاری قبول ہو گئی تھی اس حکم کے توڑ کے لیے انھی بنیادوں پر ایک اور ایف آئی آر دائر کر دی گئی اور بعض ملزموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نظر بندی کے دوران انہیں ڈرا دھمکا کر مجھے ملوّث کرنے کے لیے ان سے جھوٹے اقرارات کرائے گئے۔ کم از کم دو سرکاری ملازموں کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے اور چارج شیٹ پیش ہو جانے کے باوجود انہیں معطل کرنے کے ضمن میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ایک وعدہ معاف گواہ مسمّی سیّد امیر حسین شاہ کو ترقی دے دی گئی ہے۔

حضور والا کو اس مقدمے کے خصائص کی ایک جھلک دکھانے کے لیے میں عرض کروں گا کہ جب میں اگست ۱۹۶۸ء میں لاہور میں تھا تو مجھے ڈاکٹر یحییٰ انٹیلی جنس مسٹر رضوی کا پیغام ملا کہ اگر میں حکومت کے خلاف تنقید کو نرم کر دوں تو یہ اور دوسرے مقدمات واپس لے لیے جائیں گے۔

ٹریکٹروں کے مقدمے کے اندراج کے بعد مغربی پاکستان کے وزیر داخلہ نے دسمبر ۱۹۶۷ء میں کراچی میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ میرے خلاف "ڈھلے لوہے کا مقدمہ" بھی موجود ہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء کے اوائل میں دادو میں ایک تقریر کے دوران انہوں نے کہا کہ مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ میں بے گناہ ہوں۔ چھان بین کے دوران بہت سے اور موقعوں پر وہ جھوٹے اور ضرر رساں بیانات دیتے رہے ہیں جن میں جرم ثابت ہونے سے قبل ہی مجھے مجرم کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

ج/۲ ۔ غریب طلباء کی تعلیم کے لیے میرے قائم کردہ ایک ٹرسٹ کو جو میری کوششوں سے جمع ہونے والے چندے سے چلتا تھا محکمہ اوقاف نے اپنی تحویل میں لے لیا اور وزیر داخلہ نے اس دوران میں کہ میری رٹ پٹیشن زیر سماعت ہے بعض کینہ ور اور غلط بیانات جاری کیے ہیں۔

ج/۲ ۔ حال ہی میں مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ اس عرصے میں اہوم سیکرٹری کی زبان میں دہرے تحفظ کے لیے ــــ اور اس اصطلاح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت میرے ساتھ کس انداز سے نبٹ رہی ہے ۔ مجھے ایک اور جھوٹے فوجداری (criminal) مقدمے میں ملوث کر دیا گیا ہے جس میں مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے پینل کوڈ کی دفعہ ۳۰۷ کے تحت ایک جرم میں معاونت کی ہے۔

ضمیمہ د/۱ ۔ واضح طور پر جھوٹی اور بیہودہ درخواستوں پر میرے ضلع کے مال افسروں کی بار بار کی تفتیشات اور ان کی جانب سے مجھے ان کارروائیوں کی روداد کی نقول مہیا کرنے سے

انکار ایک ایسا معاملہ ہے جو کراچی کی عالی وقار ہائی کورٹ کے فیصلے کا منتظر ہے۔

د اور د ۲ - جس انداز سے اور جن حالات میں کراچی کی پولیس نے اپنے سامنے حاضر ہونے کے لیے بلوا بھیجا وہ بھی ایک متعلقہ مسئلہ ہے اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس خبر کو مقبوضہ پریس میں کس طرح اُچھالا گیا تھا۔

د اور د ۳ - میرے ضلع اور ڈویژن کے افسروں کو ہدایات بھیجی گئی ہیں کہ مجھ سے احتراز کریں، نہ تو مجھ سے ملیں جلیں اور نہ ایک شہری کے طور پر میں اپنی نجی یا عوامی تقریبات کے ضمن جو امور ان کے سامنے لاؤں ان پر کوئی توجہ دیں، یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا جو واحد افسر تھے جن سے میں حکومت سے الگ ہونے کے بعد اڑھائی سال کے عرصے میں اپنے طور پر ملا تھا۔

د اور د ۴ - پاکستان کی قومی اسمبلی کو بنکوں کے حسابات کی رازداری کا قانون پاس کیے دو ایک دن ہی ہوئے ہوں گے کہ ضلعی حکام نے میرے بنکاروں سے مطالبہ کیا کہ میرے حسابات ان کے سامنے رکھے جائیں۔ میں نے حکام سے جن میں گورنر سٹیٹ بنک اور مرکزی وزیر خزانہ تک شامل ہیں، احتجاج بھی کیا لیکن یہ غیر قانونی کوششیں جاری رہیں یہاں تک کہ بالآخر سیشن کورٹ لاڑکانہ کا ایک ایک طرفہ حکم حاصل کر لیا گیا۔

د اور د ۵ - میرے چچیرے بھائی ممتاز علی بھٹو ایم این اے اور دوسرے عزیزوں کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی جاتی رہی ہے کہ اگر انہوں نے مجھ سے قطع تعلق نہ کیا تو انہیں سنگین مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان دھمکیوں کی تعمیل میں اُن کے مزارعین اور ملازمین کے خلاف متعدد جھوٹے مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ بالآخر انہیں ۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت بغیر کسی جواز کے نظر بند کر دیا گیا۔ مشتاق علی بھٹو کو جو میرے کم سن بھتیجے ہیں حکام نے مسلسل تختۂ مشقِ ستم بنائے رکھا ہے اور انہیں بھی نومبر ۱۹۶۸ء میں پبلک آرڈر آرڈیننس کے تحت نظر بند کر دیا گیا تھا۔

د اور د ۶ ۔ جب سے میں حکومت سے رخصت ہوا ہوں ہم سے متعلق ایک سو سے زیادہ لوگوں کو ستایا گیا ہے، نظر بند کیا گیا ہے اور جیلوں میں مارا پیٹا گیا ہے۔

د اور د ۷ ۔ مسٹر غلام مصطفیٰ کھر ایم این اے کو مجھ سے ذاتی دوستی کی بنا پر متعدد فوجداری مقدمات میں ملوث کر دیا گیا ہے جن میں ڈاکہ زنی کا ایک ایسا مقدمہ بھی شامل ہے جس کے تحت انہوں نے اپنی ہی زمینوں سے اپنے مزارعین کے حصے کی چند من کپاس زبردستی اٹھا لی تھی۔ کچھ عرصہ قبل، جب تک سیشن کورٹ نے انہیں رہا کر دیا، حکام نے انہیں ملتان میں غیر قانونی طور پر علاقہ بند کر رکھا تھا۔ ان کا ایسا لگاتار پیچھا کیا گیا ہے کہ ایک گزشتہ موقع پر جب عالی وقار ہائی کورٹ نے ایک اور معاملے میں ان کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کی تو یہ بھی پیش نظر رکھا کہ یہ ضمانت ان تمام مقدموں کے لیے ہوگی جن میں وہ مطلوب ہیں۔ حکام نے اور ان کی جماعت کے قائدین نے انہیں بارہا بتایا ہے کہ اگر وہ میری دوستی ترک کر دیں تو نہ صرف ان کا فوری طور پر پیچھا چھوڑ دیا جائے بلکہ انہیں منہ مانگا انعام دیا جائیگا ۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ان کی نظر بندی کو یہ عدالت عالی وقار پہلے ہی غیر قانونی قرار دے چکی ہے۔

د اور د ۸ ۔ سندھ سے قومی اسمبلی کے ایک اور رکن کو بھی میری دوستی کی پاداش میں ہراساں کیا گیا۔ یہاں تک کہ یہ سمجھ لیا گیا کہ انہوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ انہیں تنبیہہ کی گئی کہ اگر آئندہ وہ مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تو مجھ سے احتراز کریں۔

د اور د ۹ ۔ اسی طرح سندھ سے صوبائی اسمبلی کے متعدد ارکان کو، جن میں اس علاقے کے کئی بااثر لیڈر بھی شامل ہیں، واضح طور پر تنبیہہ کی گئی کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ ان میں سے بعض پر کڑی نظر رکھی گئی ہے اور موقع موقع پر وہ زیر عتاب آتے رہے ہیں کہ مجھ سے معاشرتی طور پر کیوں ملے۔

۵ ۔ میرے سیاسی حامیوں اور دوستوں کو جس طرح ہراساں کیا گیا اور ستایا گیا اس کی ایک

ایک تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ حکومت نے اس معاملے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے اب ہر کوئی واقف ہو چکا ہو گا ۔ عدالتِ عالی وقار کو اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے چند مثالیں عرض کی جاتی ہیں ۔

۱ جب پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی جا رہی تھی تو اس مقام کو جہاں کانفرنس کے لیے سٹیج بنائی جا رہی تھی نذرِ آتش کرنے کی کوشش کی گئی ۔

۲ حکومت نے لاہور اور ملتان میں میرے جلسوں کو تہ و بالا کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ میں الگ طور پر عرض کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی میں نے تقریر کی ہے حکومت نے رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ لاؤڈ سپیکروں کی اجازت نہیں دی گئی ، دفعہ ۱۴۴ فوجداری کے تحت امتناعی حکم کو بے دریغ نافذ کیا گیا ہے اور دفعہ ۱۴۴ فوجداری کی شرائط کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے ۔ ساری انتظامیہ کو اس نہج پر ڈھال دیا گیا ہے کہ مجھے عوام تک پہنچنے سے باز رکھا جائے ۔

۳ ڈیرہ اسماعیل خاں میں حکومت کے ایک وزیر کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ تشدد کا استعمال کر کے اور دفعہ ۱۴۴ کو توڑ کر میرے دورے کو کامیاب ہونے سے روک دے حکومت نے جھوٹے پریس نوٹ جاری کیے ہیں اور اطلاعات کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لایا گیا ہے تاکہ میری سیاسی سرگرمیوں اور مقاصد کے بارے میں غلط باتیں پھیلا دی جائیں۔ سول سروس کی روایات کو ملیا میٹ کر کے ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے حکام نے براہِ راست اور از راہِ تمسخر پریس میں سیاسی نوعیت کے جانبدارانہ بیانات دیے ہیں۔ گورنر مغربی پاکستان نے میرے خلاف گالی آمیز اور جلی کٹی زبان استعمال کی ہے ۔

۴ ۷ر نومبر ۱۹۶۸ء کو جب میں شیر پاؤ سے کار کے ذریعے راولپنڈی پہنچا تو سڑک پر پولی ٹیکنیک کے طلبا کے ایک بڑے ہجوم نے مجھے خوش آمدید کہا جو اپنے انسٹی ٹیوٹ سے دو ایک میل آگے آ کر جمع تھے۔ کیونکہ پولیس نے اس کی طرف جانے والی شاہراہ بند کر رکھی

تھی۔ جب ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل آیا تو میں نے مال کے سارے علاقے کو اشک آور گیس کے دھوئیں میں اٹا پایا۔ مجھے پتا چلا کہ متعدد طلباء جو گارڈن کالج سے جلوس کی صورت میں نکلے تھے تاکہ لنڈی کوتل گریدے ہوئے اپنے مال کی ضبطی کے خلاف احتجاج کریں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے سبزہ زار میں جمع ہو گئے تھے جہاں کسی طرح کے اشتعال کے بغیر، انہیں اچانک اور بے رحمانہ مارا پیٹا گیا اور بھگا دیا گیا۔ ہوٹل میں پہنچنے کے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے پولی ٹیکنیک سے ایک ٹیلی فون موصول ہوا کہ پولیس نے وہاں گولی چلا دی ہے جس کے نتیجے میں ایک طالبعلم عبدالحمید کی موت واقع ہو گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ طلباء مُصر ہیں کہ لاش کو جلوس کی صورت میں ایوان صدر لے جائیں اور چاہتے ہیں کہ میں جلوس کی قیادت کروں۔ میں نے طلباء کو مشورہ دیا کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے صورتِ حال مزید خراب ہو جائے۔ میں نے اُن سے پُرزور اپیل کی کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں کشیدگی کو مزید نہ بڑھنے دیں۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی پارٹی کے کچھ لوگوں کو پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ بھیجوں تاکہ وہ طلباء پر حکومت کے پیدا کردہ بحران میں نظم و ضبط کی ضرورت کو واضح کر سکیں۔ وہ طلباء سے رابطہ پیدا نہ کر سکے۔ کیونکہ پولیس نے انسٹی ٹیوٹ کو بند کر رکھا تھا۔ ۸، نومبر کو تین بجے سہ پہر کے قریب میں بذریعہ کار راولپنڈی سے پنڈی گھیب روانہ ہوا تاکہ عبدالحمید کے خاندان سے اظہارِ تعزیت کر سکوں۔ مسٹر خورشید حسن میر ایڈووکیٹ، جو پاکستان پیپلز پارٹی ضلع راولپنڈی کے چیئرمین ہیں میرے ہمراہ تھے۔ اگلی صبح انہیں آتش زنی کے ایک مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا، جو مبینہ طور پر راولپنڈی میں ۸، نومبر ۱۹۶۸ء کو تین بجے سہ پہر کے بعد ہوا تھا۔ جب سیشن کورٹ نے ان کی ضمانت قبول کر لی — اور اس حکم پر بعد میں ہائی کورٹ نے بھی مہر تصدیق ثبت کی تھی — تو انہیں ۱۰، نومبر کو، ان کی رٹ پٹیشن کی پیشی کے دوران منسوخ ہونے والے ایک حکم کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس سے میری پارٹی اور پارٹی کے ارکان کے بارے میں حکومت کے رویّے کا مختصر سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میری پارٹی کی اصولی کمیٹی کے ایک

رکن ڈاکٹر مبشر حسن کو اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا کہ وہ ”حکومت کے خلاف نفرت پھیلا رہے تھے“۔ قومی اسمبلی کے دو ارکان کو، جن میں سے ایک میرا عزیز اور دوسرا دوست ہے، محض اس لیے گرفتار کر لیا گیا کہ انہیں گارڈن کالج راولپنڈی میں دیکھا گیا تھا اور یوں ۱۳ نومبر اور اس کے بعد اندھا دھند گرفتاریوں کی ایک لہر وجود میں آئی۔

نمبر ۱ مجھے ۱۳ نومبر کی ابتدائی گھڑیوں میں لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن، رکن، اصولی کمیٹی پاکستان پیپلز پارٹی کے گھر سے گرفتار کیا گیا جہاں میں اور مسٹر ممتاز علی بھٹو ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری گرفتاری کے چند منٹ بعد مسٹر ممتاز علی بھٹو اور ڈاکٹر مبشر کو گرفتار کر لیا گیا اور بیگم مبشر کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ مجھے میانوالی جیل لے جایا گیا جہاں میں صبح سات بجے پہنچ گیا۔ میری گہری تلاشی لی گئی، میرے سامان کی ایک ایک چیز دیکھی گئی۔ میرے کاغذات اور کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ حالانکہ قانون کے تحت مجھے اجازت تھی کہ یہ چیزیں میرے پاس رہتیں۔

مجھے ایک خستہ حال کوٹھڑی میں محبوس کیا گیا جو چوہوں اور مچھروں سے اٹی ہوئی تھی اور چارپائی ایک زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔ اس سے ملحقہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا کہ اُسے غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جائے لیکن وہ اس قدر غلیظ تھا کہ اس میں داخل ہوتے ہوئے بھی گھن آتی تھی۔ خوراک لال آٹے کی دو چپاتیوں پر اور دال پر جس میں پتھر تھے یا دو ذرا ذرا سی بوٹیاں، مشتمل تھی۔ جب تک میں وہاں رہا ایک تیز بتی چوبیس گھنٹے جلتی رہتی تھی جس سے رات کو سونا محال تھا۔ مجھے قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہائیکورٹ نے میرے وکلاء کو مجھ سے ملنے کی اجازت دے دی ہے تو میں نے فوری طور پر کچھ کاغذ مانگا تاکہ میں ان سے ملاقات کے لیے کچھ اندراجات تیار کر لوں۔ میری بار بار کی درخواستوں کے باوجود مجھے ۱۸ نومبر کی سہ پہر تک تحریری کاغذ نہ دیا گیا۔ میرے نام خطوط اور تاریں مجھے نہ پہنچائی گئیں۔ ”پاکستان ٹائمز“ اور ”مشرق“ کے سوا مجھے کوئی اور اخبار مہیا نہ کیا جاتا تھا۔ جیسا

کہ عالی وقار ہائی کورٹ نے حکم دیا تھا کہ تمام نظربندوں کو ایک ہی جیل میں رکھا جائے ۱۸ نومبر کی شام کو مجھے ساہیوال کی جیل میں لے جایا گیا جہاں میں ۱۹ نومبر کی ابتدائی گھڑیوں میں پہنچا۔

نمبر ۲ میری نظربندی کے لیے ساہیوال جیل میں جو انتظامات کیے گئے وہ بے قاعدہ تھے اور وہاں بھی مجھے قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ یہاں چوہوں کی جگہ کمرہ چمگادڑوں سے بھرا ہوا تھا اور ان سے بچنے کے لیے میں اپنے چہرے پر تولیہ لپیٹ کر سوتا تھا۔ مچھروں اور مکھیوں کی بھرمار تھی۔ غسل خانہ کوٹھڑی سے الگ تھا۔ اسے اور لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ جیل کا دستور ہے کہ اے اور بی کلاس کے نظربندوں کو ذاتی خدمت کے لیے ایک قیدی دے دیا جاتا ہے۔ جو مشقتی مجھے دیا گیا اُسے کہا گیا کہ اگر اُس نے مجھ سے بات کی، تو اس کی کھال کھینچ دی جائے گی۔ میانوالی جیل کے برعکس اس شخص کو میرا کھانا تیار کرنے کے لیے سبزی کاٹنے کی چھُری تک نہ دی گئی۔ اسی طرح میانوالی کے برعکس جہاں میری کوٹھڑی میں شام کے ۸ بجے تالا ڈالا جاتا تھا یہاں ۵ بجے شام ہی وارڈن مجھے بند کرنے آجاتا تھا۔ البتہ میانوالی کی طرح خوراک یہاں بھی ناخوردنی اور ناکافی تھی۔ جب ہائی کورٹ کے حکم کے بموجب شیخ محمد رشید ایڈووکیٹ نے مجھ سے ملاقات کی تو میں نے انہیں وہ دو ذرا ذرا سی بوٹیاں دکھائیں جن پر میرا کھانا مشتمل تھا۔ قانون کے برخلاف نہ مجھے ریڈیو استعمال کرنے کی اجازت تھی اور نہ خوراک کا ذاتی انتظام کرنے کی۔ میں نے جیل کے حکام کو پانچ یا چھ درخواستیں بھیجیں جن میں اپنی نظربندی کی غیر قانونی صورتوں پر احتجاج کیا گیا تھا۔ لیکن نہ تو یہ درخواستیں مجھے لوٹائی گئیں اور نہ ان پر کوئی عمل ہوا۔ میں نے ان درخواستوں پر نشان دہی کی تھی کہ اے کلاس نظربند ہونے کے اعتبار سے مجھے بعض سہولتوں کا حق حاصل ہے جن سے مجھے دیدہ دانستہ اور کینہ وری سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ میرا ٹم زاد اور میرے دوست اس جیل میں تھے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ

ہمیں ایک دوسرے سے مطبوعات کا تبادلہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کسی دوسرے قیدی کو مجھے ملنے یا دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یوں سمجھیے کہ جب مجھے اپنے وکلاء سے ملنے کے لیے اپنی وارڈ سے نکل کر سپرنٹنڈنٹ کے دفتر جانا پڑتا تھا تو تمام راستے کو خالی کرایا جاتا تھا۔ میری ضروری ڈاک روک لی جاتی تھی۔ مجھے صرف وہ خطوط ملتے تھے جو میرے بچے لکھتے تھے یا پھر عوام کی جانب سے اِدھر اُدھر کے خطوط یا عید کارڈ۔

نمبر ۳ مذکورہ بالا غیر قانونی حرکتوں کے باوجود حکومت نے ایک جھوٹا پریس نوٹ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ میری بڑی نگہداشت ہو رہی ہے اور مجھے کوئی شکایت نہیں۔ جونہی میں نے یہ جھوٹا پریس نوٹ پڑھا میں نے تحریری طور پر اس کے خلاف احتجاج کیا اور اپنی سابقہ شکایات کو دہرایا کہ مجھے قیدِ تنہائی میں رکھا جا رہا ہے اور قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجھے دوسری سہولتیں بھی حاصل نہیں۔ جب عدالت نے ازراہِ کرم میری شکایات کا جائزہ لیا تو ایک انتہائی ذمہ دار سرکاری افسر کی جانب سے جھوٹا بیان حلفی داخل کر دیا گیا۔ ساہیوال جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بھی اس عدالتِ عالی وقار کے رُوبرُو یہ تسلیم کیا کہ بالائی احکام کے تحت مجھے کسی سے بھی ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔

(۳۱) یہ ہے وہ طریقہ جس سے حکومت میرے درپے ہے۔ میں آٹھ سال تک مرکزی حکومت کا وزیر اور دورانِ جنگ میں وزیرِ خارجہ رہا ہوں۔ میری ملکی خدمات نے دوستوں سے داد و تحسین اور مخالفوں سے رشک و حسد پایا۔ ممتاز مفکر برٹرینڈرسل نے جن کی ساری زندگی جبر و استبداد کے خلاف ایک شاندار جدوجہد کے طور پر گزری ہے ۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء کے ہفت روزہ "اکانومسٹ" کے نام "ایوب کا حریف" کے زیرِ عنوان اپنے خط میں کہا تھا:

"جناب والا! آپ نے (۲۰ اگست ۱۹۶۶ء کو) مسٹر بھٹو پر جو حملہ کیا ہے اُسے اہلِ مغرب کی نظر میں مسٹر بھٹو کے گناہ کے پس منظر میں دیکھا جائے

تو وہ ایک ایسی اہم شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جس نے پاکستان کو افریشائی دنیا کے سیاق سباق میں رکھتے ہوئے اور اسے ان ملکوں کی صف سے جدا کر کے جن پر امریکہ کا غلبہ ہے حریت نواز پالیسی کا نقشہ بنایا۔

"ان قومی قائدوں کا مقدر جو اپنے عوام کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہیں، روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے سوا اس کے وہ نت نئے دباؤ کا سامنا کرنے کے وسائل رکھتے ہوں جو ان پر ڈالا جاتا ہے اور جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ "اکانوسٹ" جیسے جرائد ان پر ناخوش گوار لیبل لگاتے ہیں۔ مسٹر بھٹو اپنے ملک کے قومی قائد ہیں جو جناح کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور تالیوں کا وہ لامتناہی سلسلہ جس سے ان کی پذیرائی کی جاتی ہے صرف لنڈن تک محدود نہیں۔ ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں اور جو اُس کردار کے مدّاح ہیں جو افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے عوام کی معاشرتی اُمنگوں کی ہمنوائی میں وہ اپنے ملک کی حریت نواز پالیسی تشکیل کرنے میں ادا کر رہے ہیں۔"

صدر احمد سوئیکارنو، جنہوں نے پاکستان کو بے مثال امداد دی تھی، جب ۲۰ اپریل ۱۹۶۶ء کو جکارتا کے مردیکا محل میں مجھے ریپبلک آف انڈونیشیا کے "آرڈر" سے نواز رہے تھے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ بات ان کے لیے باعثِ فخر ہے کہ انڈونیشیا اور پاکستان کی دوستی کے ضمن میں میری عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر مجھے "آرڈر" عطا کر رہے ہیں۔ انہوں نے میرے متعلق کہا تھا کہ میں "آزادی کا عظیم مجاہد

اور افریشائی اقوام کے استحکام کا عظیم کارکن" ہوں۔

سوویت روس اس وقت تک پاکستان کا مخالف رہا جب کہ میں نے ۱۹۶۰ء میں ماسکو جا کر اس ملک سے ایک اہم معاہدہ انجام نہیں دیا۔ اس عظیم طاقت کے صدر میکویان نے ایک محفل میں پاکستانی اور روسی وفد کی موجودگی میں پاکستان کے لیے میری خدمات کو سراہا۔ انہوں نے صدر ایوب خاں سے کہا۔ "مسٹر بھٹو غیر معمولی طور پر سمجھ دار انسان ہیں اور میری "جواں سالی اور قوت کار صدر ایوب خان اور پاکستان کے لیے طاقت کا زبردست سرچشمہ ہیں۔" صدر میکویان نے صدر ایوب خان کو مبارکباد دی کہ میرے" درجہ ذہانت" کا وزیر ان کی کابینہ میں شامل ہے۔

چونتیس سال کی عمر میں اگست ۱۹۶۴ء میں مجھے ملک کا اعلیٰ اعزاز "ہلال پاکستان" عطا کیا گیا۔ یہ ایوارڈ دیتے ہوئے صدر ایوب خان نے صدر کے مہمان خانے میں جمع ہونے والے مسلم لیگی قائدین کی موجودگی میں ملک کے نوجوانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ میرے نقش قدم پر چلیں۔

(۳۲) میں بے جا غرور سے نہیں، محض بر سبیل تذکرہ عرض کرتا ہوں کہ پاکستان میں میرے مقام کے بارے میں عالمی قائدین اور صدر ایوب خان کس قدر مغالطے میں رہے ہیں۔ حکومت کی صوابدید ہے کہ میری جگہ اس جیل کی کوٹھڑی ہے جس کے بارے میں خود حکومت مغربی پاکستان کے ۱۳ دسمبر ۱۹۶۸ء کے پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ وہ بدنام اور عادی مجرموں کے لیے مخصوص ہے۔ حکومت کی خوب تلی رائے میں میری جگہ مغربی پاکستان کی اس بدترین جیل میں ہے تاکہ میں وہاں قید تنہائی میں سڑتا رہوں اور مجھے وہ عام سہولتیں بھی میسر نہ ہوں جو قانوناً میرا حق ہیں۔

(۳۳) مائی لارڈز! دورِ عیسوی سے ۳۹۹ سال قبل ایتھنز کے حکمرانوں نے بھی ایک فلسفی کو اس پاداش میں سزائے موت سنائی تھی کہ اُس نے شہر کے نوجوانوں کو گمراہ کیا ہے۔ سقراط کو

پینے کے لیے زہر کا پیالہ دیا گیا تھا۔

شاید اسی لیے ہوم سیکرٹری نے گورنر کے نام اپنے ایک نوٹ میں کہا ہے کہ:

> "مسٹر زیڈ۔اے بھٹو نے جنگ کی راہ اختیار کر لی ہے۔موجودہ حکومت کے خلاف اپنے ملتقمانہ عزائم کی تکمیل کے لیے وہ سرِ عام تشدد اور خون خرابے کی باتیں کرتے رہے ہیں۔"

(۳۴) یہ بیان کس قدر ستم ظریفانہ ہے! جب سے میں حکومت سے رخصت ہوا ہوں میں زندگی اور موت کے ناٹک میں اُلجھا رہا ہوں۔میرے خاندان کو اچھوتوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑی ہے۔میرا حقہ پانی اتنی شدّت سے بند کیا گیا ہے کہ میرے کمسن بچّوں کے علاج معالجے کے لیے بلوائے جانے والے ڈاکٹروں کی بھی پوچھ گچھ ہوتی رہی ہے۔اگر غیر ملکی سفارتی نمائندے مجھ سے ملتے ہیں تو ان کی حکومتوں کو احتجاجی مراسلے بھیجے جاتے ہیں۔میرا قانونی دفاع کرنے والے وکلاء کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔دوستوں کو مجھ سے دُور رہنے کی تنبیہہ کی گئی ہے اور ملازموں کو خوف دلا کر مخبر بننے کے لیے کہا گیا ہے۔خفیہ پولیس قدم قدم پر ہمارا پیچھا کرتی ہے۔حکام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہمارے لیے مشکلات پیدا کریں۔اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ عام شہریوں کی حیثیت سے ہمیں جو ضروریات درپیش ہوں ان پر بھی کان نہ دھریں۔بدترین قسم کے کارندوں کو ہماری تحصیل میں متعین کیا گیا ہے تاکہ ہمارے لیے آئے دن خوف و ہراس پیدا کرتے رہیں اور انتظامیہ کے دروازے ہیں، کہ ہمارے اُوپر بند ہیں۔

میں مملکت کے جن ممتاز عہدوں پر فائز رہا ان کے بغیر بھی اور مجھے جو اعزازات عطا کیے گئے تھے ان کے پیش نظر بھی میرا حق تھا کہ مجھے عزّت اور لحاظ کا مستحق سمجھا جاتا۔نسل در نسل میرے خاندان نے سندھ کی، غیر منقسم ہندوستان کی اور تقسیم کے بعد پاکستان کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔یہ ایک تاریخی امر ہے اور ان جتائی کہانیوں کا کوئی باب نہیں جو ضلعی

گزیٹیروں کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔

میں جنگ کی راہ کیونکر اختیار کر سکتا ہوں جب کہ جھوٹے فوجداری مقدمات گھڑے جا رہے ہوں اور حکومت مجھے اہل کاروں کے ذریعے تھانوں میں بلوا بلوا کر بے عزت کرا رہی ہو۔ بہرحال صدر ایوب کے بقول "دوسروں کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے" کا سبق سکھانے کا کوئی طریقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ستمبر کا سارا مہینہ پولیس نے لغوی طور پر میرا ناک میں دم کیے رکھا۔ چنانچہ ستمبر کا مہینہ حیدرآباد میں میری تقریر کے علاوہ دیگر وجوہ کی بنا پر بھی اہم ہے۔

(۳۵) جب شدید ستم کشی اور حوصلہ شکن اہانتوں کے سایے میں ۱۲، ستمبر کو میں نے حیدرآباد میں تقریر کی تو میرے اس اعلان اور فیصلے نے حکومت کو بوکھلا کر رکھ دیا کہ میں مناسب موقع پر لاہور میں تاشقند کے بارے میں زبان کھولوں گا اور انتخابات میں حصہ لوں گا۔ میرے خطاب کے تھوڑی ہی دیر بعد، غیر متوقع طور پر، مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر اعوان نے ایک مشترکہ دوست کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کیا جس نے مجھے بتایا کہ مسٹر اعوان مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ جب ہم اسی شام سندھ کلب میں ملے تو مسٹر اعوان نے حتمی طور پر یہ جاننا چاہا کہ میں نے حیدرآباد میں جو اعلان کیا ہے کیا وہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ چنانچہ نہ تو پشاور یا چین کا میرا دورہ اور نہ ہی میرے وہ بیانات میری گرفتاری کی اصل وجوہ ہیں جنہیں توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے جدا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ حکومت نے مجھے انتخابات کے آغاز میں اُس وقت جیل میں ڈالا ہے جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے اپنے سیاسی فرائض کی ادائیگی میں نرم پڑنے پر مجبور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں یہ ضروری تھا کہ مجھے منظر سے الگ کر دیا جائے۔ کیونکہ میں نے حیدرآباد میں انتخابات کے بارے میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا۔ جب ایک دفعہ یہ اندازہ کر لیا گیا تو میرے خلاف کارروائی کرنے کیلئے کسی مناسب موقع کی تلاش شروع ہوئی۔ موجودہ کشیدگی، جسے حکومت نے

دیدہ دانستہ ہوا دی تھی، حکومت کے آڑے وقت میں کام آئی - اور مثالی بہانہ ثابت ہوئی -

(۳۶) میرے خلاف ایک جھوٹا فوجداری مقدمہ کھڑا کرنے کی بے ضمیرانہ کوششیں اور سرکاری حکام کو وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کرنا اسی مقصد کے تحت آتے ہیں - مطلوب یہی تھا کہ مجھے ایک فوجداری مقدمے میں سزا دلوا کر انتخابات میں حصّہ لینے کے ضمن میں نااہل قرار دے دیا جائے - جب یہ نظر آیا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو اس منصوبے کی دھار تیز ہو گئی - یہ محسوس کیا گیا کہ اس نوعیت کے کسی مقدمے کے محض دائر کر دینے سے میری سیاسی سرگرمیوں میں مؤثر طور پر مداخلت نہ کی جا سکے گی جنہیں قریب آتے ہوئے صدارتی انتخابات کے پیشِ نظر کھیل دینے کی ضرورت تھی - چنانچہ مجھے سیاسی منظر سے الگ کرنے کے لیے ایک اور ہتھکنڈا ایجاد کرنا لازم تھا - جب حکومت یوں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو موجودہ بحران نے اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں بلکہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو زیرِ استعمال لا کر مجھے پابند سلاسل کرنے کی ایک آڑ مہیا کر دی -

(۳۷) اگر حکومت کو میری حیدر آباد کی تقریر پر اعتراض تھا نہ کہ انتخابات کے بارے میں میرے اعلان پر، تو اُسے مستقل بالذات قانون کے تحت مجھے ۱۲ ستمبر کو یا اس کے لگ بھگ حیدر آباد میں گرفتار کرنا چاہیئے تھا نہ کہ ۱۳ نومبر کو لاہور میں - ایسا اس لیے نہ کیا گیا کہ انتخابات سے متعلقہ آراء کو چھوڑ کر میری آراء میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے حکومت کو پریشانی لاحق ہوتی اور میرے اعلان کردہ عزائم کو ناکام کرنے کے لیے اُسے کچھ اور وقت درکار تھا - ورنہ جو شخص "خون خرابے، انقلاب اور حکومت کا بزور تختہ الٹنے کا پرچار" کرتا ہوا سے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنے سیاسی مشن کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جایا کرتی - میں نے پشاور ریجن کا دورہ بھی مکمل

کرلیا اور اس سے قبل مجھے پکڑا نہ گیا کیونکہ میری گرفتاری کی وجوہ کا تعلق محض انتخابات کے ضمن میں میرے اعلان سے تھا نہ کہ کسی اور بات سے جو میں نے حیدر آباد میں یا سرحد کے دورے کے دوران کہی ہو۔

انقلاب کی اُس دعوت کے توڑ میں، جس کے بارے میں فرض کیا جارہا ہے کہ میں نے حیدر آباد میں ۲۱ ستمبر کو دی تھی، حکومت نے لے دے کر جو اقدام کیا وہ یہ تھا کہ مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر ایوب اعوان کو کراچی بھیجا تاکہ مجھ سے انتخابات کے بارے میں میرے فیصلے کی ذاتی طور پر تصدیق کریں نہ کہ اُس دعوت کی جو میں نے خونی انقلاب برپا کرنے کے ضمن میں دی تھی۔ گورنر موسیٰ کو اس لیے حیدر آباد نہیں بھیجا گیا تھا کہ میں نے حیدر آباد کی گلیوں میں انقلاب کے جو مورچے گاڑھے تھے انہیں ملاحظہ فرمائیں بلکہ مجھ سے سیاسی ٹکر لینے کے لیے وہ دس اکتوبر کو دربار ہال میں تقریر کرنے گئے تھے۔ جیسا کہ دستور ہے مسٹر موسیٰ کی رام کہانی کو وزراء کے باجماعت بیانوں نے اور مقبوضہ پریس نے مزید ہوا دی۔ جب یہ پتا چل گیا کہ میری تقریر قانون کی زد میں نہیں آتی تو حکومت نے اس سے سیاسی سطح پر نپٹنے کی ٹھانی اور اُس نے کوئی ایک ماہ تک یہ روش اختیار کیے رکھی۔ نہ صرف یہ کہ حکومت نے مجھے حیدر آباد میں تقریر کرنے کے فوراً بعد گرفتار نہ کیا بلکہ اُس نے میری تقریر پر سیاسی بحث مباحثے کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے "حکومت کے خلاف کھلی بغاوت کے پرچار" کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے گرفتار کرنا بے معنی بات ہے۔ سوائے اس کے کہ میری گرفتاری کی وجہ کچھ اور ہو۔ مجھے حالیہ گڑبڑ کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جیسا کہ میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، موجودہ بحران میرا پیدا کردہ نہیں۔ حکومت خود اس کی ذمہ دار ہے۔ جو گڑبڑ یہاں واقع ہوئی اب وہ مشرقی پاکستان تک پھیل چکی ہے۔ پاکستان میں اچانک جو دھماکا ہوا ہے اس کی بنا یہ ہے کہ حکومت کے خلاف لوگوں کی دبی ہوئی نفرت کا لاوا پھوٹ گیا ہے۔ مجھے اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا

جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں میری گرفتاری کی جو وجوہ دی گئی ہیں ان کا کوئی جواز نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی غیر جانبدارانہ محاسبے کی تاب نہیں لا سکتی۔ میرے حیدرآباد جانے اور بعد میں سرحد کے علاقہ کا دورہ کرنے کے درمیان کوئی پوشیدہ تعلق نہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ یہ واقعات کسی منصوبے کا جزو تھے۔ کوئی منصوبہ تھا ہی نہیں۔ حیدرآباد اور پشاور ریجن میں میری سرگرمیوں کے درمیان کوئی سازشی رشتہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ملک میں گڑبڑ پیدا کرنے کا بھی کوئی منصوبہ نہیں۔ حکومت نے موجودہ صورتِ حال سے میری گرفتاری کا بہانہ ڈھونڈنے میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے تاکہ صدارتی انتخابات کے بائیکاٹ سے متعلقہ واقعات کے دھارے کو متاثر کر سکے۔

(۴۸) حکومت کو علم تھا کہ مشرقی پاکستان سے واپسی پر میرا ارادہ تھا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد اور انتخابات کے بارے میں کچھ اہم اعلانات کروں۔ یہ بھی علم تھا کہ میں رمضان سے کچھ روز پہلے مشرقی پاکستان میں روانہ ہو جاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے موجودہ بحران کو ابھارا اور پیشتر اس کے کہ میں مشرقی پاکستان کا اہم دورہ زیرِ عمل لاتا جس پر کہ ملک کے لیے دوررس سیاسی اہمیت کے حامل بعض نازک فیصلوں کا دارومدار تھا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بات نظربندی کے حکم سے بھی واضح ہو جاتی ہے جس کے آخر میں میری نظربندی کی دیگر وجوہ کے علاوہ، یہ بھی کہا گیا ہے کہ میرے خلاف اس لیے کارروائی کی جا رہی ہے کہ مجھے پاکستان کے دوسرے حصّوں کا دورہ کرنے سے روک دیا جائے۔

(۴۹) یہ حکومت "انقلاب" کے لفظ سے اتنی کیوں بدکتی ہے جب کہ اس کا سارا ڈھانچہ طاقت پر کھڑا ہے۔ بہت سے موقعوں پر اپوزیشن کو خون خرابے کی دھمکی دی گئی ہے۔ حال میں راولپنڈی میں اسلام آباد مسلم لیگ کا نائب صدر ایک صحافی کو پولیس کی موجودگی میں پستول کی گولیوں سے زخمی کرنے کے بعد پاکستان کے دارالحکومت

کی گلیوں میں بے خوفی سے دندناتا پھرا ہے۔ راولپنڈی کے ایک طالب علم کو ٹھگوں نے زدوکوب کیا ہے۔ ایک کتبہ جس پر کلمہ لکھا تھا یوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا گویا اس ملک میں جن سنگھ کا راج ہو۔ صدر صاحب نے بارہا خون خرابے کی دھمکی دی ہے۔ گزشتہ صدارتی انتخابات کے دوران، رائے شماری کے موقع پر، فوج کو گلیوں میں بلا لیا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں مسلم لیگیوں سے ڈھاکے میں خطاب کرتے ہوئے صدر صاحب نے الم نشرح کر دیا تھا کہ اپنے مخالفین سے نپٹنے کے لیے وہ "ہتھیاروں کی زبان" استعمال کریں گے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کو صدر صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام حصوں سے لاہور میں جمع ہونے والے مسلم لیگیوں سے خطاب کرتے ہوئے کچھ انکشاف انگیز آرا کا اظہار کیا۔ سیاسی صورتِ حال کا احاطہ کرتے ہوئے صدر صاحب نے اپنے حامیوں کو بتایا:

> "جو لوگ اس نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں انہیں علم ہونا چاہیئے کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو ملک میں خانہ جنگی برپا ہو جائے گی۔"

کسی سربراہِ مملکت نے اس سے واضح تر اعلانِ جنگ نہ کیا ہوگا۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ مجمع کو اکسایا جائے کہ اسلام آباد میں اپنی پارٹی کے نائب صدر کے نقشِ قدم پر چلیں۔ خانہ جنگی کی یہ دھمکی خلا میں نہیں دی گئی۔ اس کی جڑیں حکومت کے نفسی بحران اور اُس کے اُن کارناموں میں ہیں جو دس سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ معتمدوں کو مسلح کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے تحت مزید تیاریاں بھی کی جا رہی ہیں۔ کیا حکومت کے عہدِ زریں کا تتمہ ایک المناک برادر کشانہ جنگ سے رقم کیا جائے گا؟ کیا "دورِ ترقی" کی کڑوی کسیلی فصل کا انجام ایک اور اسپین یا نائجیریا کی شکل میں ہوگا؟ کیا پاکستان کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان کے ہاتھوں

مسلمان قتل ہو اور بیسویں صدی میں کربلا کو دہرایا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو حکومت ببانگِ دہل اعلانِ جنگ کیوں کر رہی ہے۔ خانہ جنگی کسی قوم کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ تیس سال ہو گئے ہیں اور اسپین ابھی تک خانہ جنگی کے زخم چاٹ رہا ہے اور اب نائجیریا ایک ہولناک خواب سے گزر رہا ہے۔ جب انقلاب آتا ہے تو پوری قوم ظلم وستم کے خلاف متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ خانہ جنگی میں لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں اور اس کا دائم عذاب رہتا ہے۔ صدر صاحب تو کھُلی کھُلی طاقت استعمال کر سکتے اور اس کی دھمکی دے سکتے ہیں لیکن دوسروں کو اس کی بھی اجازت نہیں کہ لوگوں کو اس کے بارے میں خبردار ہی سکیں۔

ایک طرف تو حکومت خانہ جنگی کی دھمکی دیتی ہے اور دوسری طرف وہ لوگوں کو "اتحاد، ایمان اور تنظیم" کی یاد دلاتی ہے۔ موجودہ بحران نے حکومت کو قائدِ اعظم کی یاد کا بہت شعور بخش دیا ہے۔ صدر صاحب نے ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۸ء کو قوم کے نام ایک اور پیغام میں کہا ہے:

> "قائدِ اعظم کا نعرہ — اتحاد، ایمان اور تنظیم — لازوال معنویت کا حامل ہے، جو لوگ سیاست سے سروکار رکھتے ہیں ان پر لازم ہے کہ اپنے فکر وعمل کو اس نعرے کا تابع بنائیں۔"

معمارِ پاکستان کے فلسفے کو صحیح صحیح سمجھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ ہمیں یہ پتا چلے کہ صدر ایوب خاں نے سیاست دانوں کو آخر کس سیاق وسباق میں "اتحاد، ایمان اور تنظیم" کا پرچار کیا ہے؟ موجودہ تحریک میں شامل کوئی شخص بھی اسلام کے خلاف نہیں۔ دین کے معاملے میں تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ البتہ عوام اور حکومت کے درمیان اتحاد اور تنظیم کے معنی میں سنگین اختلاف ہے۔ ایک اتحاد تو وہ ہے جو آزاد لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے متحد ہوتے ہیں۔

ایک ان لوگوں کا اتحاد ہے جو آزادی اور آدرش کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ عوام بیرونی جارحیت اور اندرونی مطلق العنانی کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک اور طرح کا اتحاد بھی ہے۔ روم کے قدیم باشندے اسے "پیکس رد مانا" کہتے تھے۔ انگریز اپنے "راج" کے استحکام کے لیے اس کے جویا رہتے تھے۔ یہ وہ اتحاد ہے جو بیرونی استعمار کی جانب سے یا اندرونی آمریت کے ذریعے سے تھوپا جاتا ہے۔ عوام اپنی رضا سے آزادی کے لیے متحد ہوا کرتے ہیں، غلامی کے لیے نہیں۔ یہ کوئی عجوبہ نہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں کی غلامی اور کانگریس کے استحصال کے خلاف شاندار اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ وہ پاکستان کے لیے یا دوسرے لفظوں میں آزادی اور مساوات کے لیے متحد ہوئے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہندوستان کی مسلمان آبادی کو پاکستان کا جزو بننا تھا بلکہ اس لیے کہ نتائج کے علی الرغم اس جدوجہد کا مطلب تھا آزادی۔ یہ تھا اتحاد کا وہ نظریہ جس کا پرچار معمارِ پاکستان نے برصغیر کے مسلمانوں کو کیا تھا۔ کیا صدر صاحب کی اتحاد کی اپیل کا خطاب کسی آدرش کے لیے جدوجہد کرنے والے آزاد عوام سے ہے؟ کیا یہ جموں اور کشمیر کے حقِ خود ارادیت کے لیے ہے یا بھارت سے مشترکہ دفاع کے لیے؟ اتحاد کا مطالبہ فرخا براج کے خلاف بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ بھارت کے اس دعوے کے باوجود کہ دریائے گنگا اس کی ملکیت ہے، حکومت بھارت کے ساتھ مذاکرات کر رہی ہے۔ کیا عوام سے بالغ رائے دہی اور بنیادی حقوق کے خلاف متحد ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے یا ہنگامی قوانین کی حمایت میں یا اس لیے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے کی محنت سے بیس خاندانوں کی اقتصادی اقلیم کو فروغ دیں۔ یہی نوعیت اس سوال کی ہے کہ کیا تنظیم کی اپیل کا خطاب بھی آزاد عوام سے ہے؟ آمریت اپنی تنظیم آپ ہوتی ہے۔ دفعہ ۴۴، ڈیفنس آف پاکستان رولز، سیکورٹی قوانین اور قانون فوجداری کا ترمیمی

ایک تنظیم بھی کی ہمہ گیر بنیاد فراہم کر دیتے ہیں۔ کیا تنظیم کی اپیل کا مطلب ہے قبرستان کا نظم و ضبط، حقوق سے محرومی پر خاموشی سے سر تسلیم خم کرنا، حکومت کے شخصی فرمان کی غلامانہ اطاعت۔

جو اتحاد، ایمان اور تنظیم محمد علی جناح نے پیش کیے تھے وہ عوام کی خوش دلانہ رضامندی کے بل پر ایک آزاد معاشرے کے ستونوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ معمارِ پاکستان نے مسلمانانِ ہند سے جس پاکستان کا وعدہ کیا تھا اس کے آئین اور حکومت کے لیے لازم تھا کہ انہیں عوام کی تائید حاصل ہو۔ کیا سیاستدانوں کو جمہوریت کے تقاضے کے طور پر ہماری آزادی کے مشعل بردار کے پیغام پر توجہ دینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے یا اتحاد اور تنظیم کے حصول کے لیے کسی بردہ فروش کے چابک سے کام لیا جائے گا؟

مائی لارڈز! اگر آپ بے لگام جاہ طلبی، ہوسِ اقتدار اور جلبِ زر کے پردے کے پیچھے جھانکیں تو یہ بات کھل جائے گی کہ میری گرفتاری کے مریضانہ محرکات نے دراصل اُس خوف سے جنم لیا ہے جو اُس حکومت کو عوام سے آتا ہے۔ اب جہاں پاکستانی عوام میری گرفتاری پر نالاں ہیں اور اس ضمن میں وہ اپنے احساسات کا صاف صاف اظہار بھی کر چکے ہیں وہاں یہ حکومت اور پاکستان کے دشمن باہم خوش ہو رہے ہیں کہ مجھے سیاسی منظر سے ہٹا دیا گیا ہے۔

(۴) جگر خراش تجربات کے باوجود میں نے کبھی جنگ کی راہ اختیار نہیں کی۔ میں نے ابھی تک جنگ بندی یا اعلانِ تاشقند کی داستان بھی نہیں چھیڑی۔
میری جدوجہد کا منتہا قومی احیاء ہے۔ میں قائدِ اعظم اور اقبال کا جھنڈا سربلند رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا پر ثابت کر دیا جائے کہ بارہ کروڑ جیالے عوام کی یہ اسلامی مملکت اوجِ کمال کو پہنچ سکتی ہے اور جس آزادی اور مساوات سے اسلام نے

تہذیب کا چراغ روشن کیا اس سے بہرہ ور انسانوں کے آدرش کو لباس مراد پہنا سکتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ عدل و انصاف کا وہی نور ایک مرتبہ پھر دل افروز ثقافتوں کے اجتماع کو منور کر دے۔ میری آرزو ہے کہ ہمارے عوام اخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں اور مساوات کی آب و تاب میں یکساں حصے دار ہوں۔

وقت آئے گا کہ قسمت کا پہیہ گردش کرے گا اور اس گردش کے انقلاب سے ایک بہتر مستقبل طلوع ہوگا۔

پاکستان کو جو امور درپیش ہیں وہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ ہر دور میں ایک موقع آتا ہے کہ انہیں سنوارا یا بگاڑا جا سکتا ہے۔ یہ امور دکھ بھرے لمحات کے آفاق میں ڈوب جاتے اور مستقبل کی ایک حسین و جمیل صورت اُبھار جاتے ہیں —— ایک ایسا مستقبل جس میں پاکستان ملتِ اسلامیہ کا ناقابلِ تسخیر قلعہ اور دنیا بھر کے مظلوموں کا خدمت گار بن جائے گا اور جو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک کشمیر میں جارحیت کے آخری نشان کو نہیں مٹا دیتا اور بیت المقدس کو آزاد نہیں کرا لیتا۔

(۱۴) مذکورہ بالا بیانات میرے اپنے یقین، علم اور یادداشت پر کہ جس کے بارے میں مجھے حتمی یقین ہے کہ سچ اور صحیح ہیں اور اس معلومات، مواد اور مشورے پر مبنی ہیں جو مجھے اُن لوگوں سے ملا، جنہیں عدالت عالی وقار نے اس حلفی بیان کی تیاری میں میری مدد کرنے کی اجازت دی تھی اور میں حتمی طور پر یقین رکھتا ہوں کہ مذکورہ معلومات، مواد اور مشورہ جو اس صورت میں مجھے دیا گیا وہ سچ اور صحیح ہے۔

(۲۴) میں اس حلفی بیان کے ساتھ اس کی تائید میں پیش ہونے والی تمام

دستاویزوں، عدالتی فیصلوں، احکامات، درخواستوں، ریکارڈوں اور اخباری روداددوں کی الگ فہرست کا ضمیمہ شامل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

لاہور — دستخط: ذوالفقار علی بھٹو

۳ر جنوری ۱۹۶۹ء — (حلیف)

بیانؔ کی اشاعت روکنے کی استدعا اور جرح

۱۴ر فروری کو بورسٹل جیل میں مسٹر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت دوبارہ شروع ہوئی۔ مسٹر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے علاوہ ائیر مارشل اصغر خاں، مسٹر جے اے رحیم، ڈاکٹر بشیر حسن، مسٹر محمد حنیف رامے، مسٹر ممتاز علی بھٹو اور مسٹر غلام مصطفےٰ کھر، مولانا عبدالستار خان نیازی، ملک غلام جیلانی اور آغا شورش کاشمیری بھی عدالت میں موجود تھے۔

ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر نے عدالت سے کہا کہ انہوں نے ایک درخواست پیش کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حلفی بیان کے بعض پیراگراف غیر متعلق اور قانونی طور پر پیش کیے جانے کے قابل نہیں۔ اس لیے اخبارات میں اُن کی اشاعت کی ممانعت کر دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس ضمن میں دلائل دوسرے سرکاری وکیل مسٹر اسماعیل بھٹی پیش کریں گے۔

مسٹر اسماعیل بھٹی نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظر بند نے اپنے حلفی بیان میں گمراہ کن اور غلط الزامات لگائے ہیں جن کی حکومت نے تردید کی ہے۔ یہ بیان غیر ضروری طور پر طویل ہے اور اس میں ایسا مواد ہے جو سراسر غیر متعلق اور غیر ضروری ہے۔ اس حلفی بیان کا مقصد زیر بحث مسئلے کی اصل تہ تک پہنچنے میں رکاوٹ اور

تاخیر پیدا کرنا ہے۔

مسٹر بھٹی نے کہا کہ حلفی بیان میں عدالت کو سیاسی منبر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے افراد کے خلاف الزامات لگائے گئے ہیں جو عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ یہ الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں اور یہ جانتے ہوئے لگائے گئے ہیں کہ عدالت یہ تعین کرنے کے لیے طویل تحقیقات نہیں کر سکتی کہ آیا یہ الزامات غلط ہیں یا صحیح۔

مسٹر بھٹی نے کہا کہ نظر بند کو یہ معلوم ہے کہ صدر اور گورنر کو ان الزامات کی صداقت کا تعین کرنے کے لیے عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا جو حقیقت میں بے بنیاد ہیں۔ مسٹر بھٹی نے کہا کہ یہ بیان حلفی صفائی کا بیان نہیں بلکہ ایک سیاسی تقریر ہے۔ بیان صفائی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس میں اختصار کے ساتھ اصل حقائق بتائے گئے ہوں۔ اس حلفی بیان میں متعلقہ حقائق اختصار سے بیان نہیں کیے گئے۔

انہوں نے کہا کہ قانون کے مطابق یہ ضروری ہے کہ حلفی بیان ایسے حقائق تک محدود ہو جنہیں گواہ اپنے علم کے مطابق ثابت کر سکے۔ یہ حلفی بیان حقائق پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں غیر متعلقہ الزامات اور دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

مسٹر بھٹی نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بیان حلفی میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ مقدمے کی نوعیت اور زیر بحث مسائل کے پیش نظر سراسر غیر ضروری اور بے محل ہیں۔ حلفی بیان میں جو الزامات اور باتیں کہی گئی ہیں وہ، قانون شہادت کے مطابق، بیان کا حصہ نہیں بن سکتیں، اس لیے انہیں حلفی بیان میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

بیان حلفی میں صدرِ مملکت، صوبائی گورنر، مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر ایوب اعوان، مرکزی حکومت کے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو مسٹر رضوی اور صدر ایوب کے دو

بیٹوں کے تذکرے کے بارے میں اپنے موقف پر زور دیتے ہوئے سرکاری وکیل نے کہا کہ یہ سب لوگ عدالت عالیہ میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتے اس لیے ان سے منسوب کی جانے والی باتوں کو عدالت کے ریکارڈ میں شامل نہ کیا جائے۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے یقین دلایا کہ جن اصحاب کو قانون کے مطابق عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے اگر ضروری ہوا تو انہیں طلب کر لیا جائے گا اور جن کو طلب نہیں کیا جا سکتا وہ اپنے حلفی بیان پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صوبائی ہوم سیکرٹری نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ صوبے کی صورتِ حال مسٹر بھٹو کی تقریروں سے پہلے ہی خراب تھی اور مسٹر بھٹو اپنی تقریروں کے ذریعے جلتی پر تیل ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر ہوم سیکرٹری یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں تو مسٹر بھٹو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوبے کی موجودہ صورتِ حال میری پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ اور وجوہ کار فرما ہیں، میری تقریروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مسٹر بھٹو نے اپنے حلفی بیان میں ان وجوہ کا ذکر کیا ہے جو اُن کے خیال میں موجودہ صورتِ حال کی ذمہ دار ہیں۔

مسٹر اسماعیل بھٹی نے کہا کہ مسٹر بھٹو نے اپنے بیان حلفی میں حقائق بیان نہیں کیے بلکہ اپنی رائے پیش کی ہے اور اپنا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اُن کے نقطۂ نظر اور فلسفہ کا اس مقدمے کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

مسٹر جسٹس قاضی محمد گل نے سوال کیا کہ کیا رائے شہادت کے طور پر پیش نہیں کی جا سکتی۔

مسٹر اسماعیل بھٹی نے کہا کہ صرف ماہر کی رائے کو بطورِ شہادت پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ مسٹر بھٹو سیاسیات کے ماہر نہیں ہیں"

سرکاری وکیل نے خیال ظاہر کیا کہ ماہر کوئی سائنس دان یا پیشہ ور آدمی ہو

سکتا ہے۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا کہ سیاسیات نے آجکل سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے مسٹر بھٹو اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر کہہ سکتے ہیں اور اس حیثیت سے ملکی سیاسیات کے بارے میں اپنی رائے بھی دے سکتے ہیں۔ اگر ہوم سیکرٹری کا حلفی بیان غیر متعلق نہیں تھا تو مسٹر بھٹو کے حلفی بیان کو کیسے غیر متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت سنتریوں کی رپورٹوں پر کسی شخص کو نظر بند کر سکتی ہے تو اُس شخص کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اخباروں کی رپورٹوں کی بنیاد پر یہ ثابت کرے کہ اُس کی نظر بندی ناجائز ہے۔

اگرچہ سرکاری وکیل نے اپنی درخواست میں حلفی بیان میں سے پیراگراف نمبر ۶ سے لے کر ۴۸ تک کا حصہ حذف کرنے کی استدعا کی تھی لیکن دو گھنٹے کی بحث کے بعد انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ پورے کا پورا بیان قابلِ اعتراض ہے اور اُسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

حلفی بیان پڑھ کر سناتے ہوئے سرکاری وکیل کئی الفاظ کو نہ پڑھ سکے، کئی لفظوں کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا اور وہ عدالت کو نہ بتا سکے۔ اس پر فاضل ججوں نے تبصرہ کیا کہ شاید آپ نے حلفی بیان اچھی طرح پڑھا ہی نہیں۔ اگر آپ نے اسے پڑھا ہوتا تو آپ پڑھتے ہوئے نہ اٹکتے اور آپ کو لفظوں کے معنی ضرور معلوم ہوتے۔ اگرچہ یہ زبان غیر ملکی ہے لیکن کسی اچھے وکیل کو چاہیئے کہ جن الفاظ کے معنی اُسے معلوم نہ ہوں وہ اُن کے لیے ڈکشنری استعمال کرے۔ فاضل ججوں نے سرکاری وکیل سے یہ بھی کہا کہ انہوں نے بیان حلفی کے بعض حصوں کو حذف کرنے کی درخواست دی تھی اب وہ پورے بیان کو قابلِ اعتراض کہہ رہے ہیں اس لیے وہ نئی درخواست پیش کریں۔

مسٹر بھٹو نے اخبارات میں بیان حلفی کی اشاعت روکنے کی استدعا دہراتے ہوئے کہا کہ اس میں بعض ایسی باتیں ہیں جنہیں شائع کرنے والوں کے خلاف دفعہ ۱۲۴ الف استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس مرحلہ پر فاضل ججوں نے انہیں تنبیہہ کی کہ وہ دوبارہ ۱۲۴ الف کا ذکر نہ کریں۔ عدالت پہلے ہی یہ حکم دے چکی ہے کہ جو اخبارات اس مقدمے کی کارروائی شائع کریں انہیں پوری کارروائی شائع کرنی چاہیئے۔ عدالت ان کو بیان حلفی کی اشاعت سے نہیں روک سکتی، مقدمے کی کارروائی کھلی عدالت میں ہو رہی ہے، بند کمرے میں نہیں۔ فاضل ججوں نے کمرۂ عدالت میں موجود ملکی اور غیر ملکی اخبار نویسوں کو ہدایت کی کہ وہ دو روز تک حلفی بیان شائع نہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ جب عدالت یہ فیصلہ کرے گی کہ بیان حلفی کا کون سا حصہ حذف کرنے کے قابل ہے تو وہ اسے شائع کرنے کی اجازت دے دے گی۔

اس کے بعد اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل قاضی اختر نے مسٹر بھٹو پر جرح شروع کی۔

سوال :- کیا وزیر مقرر ہونے سے قبل آپ کے مسٹر اسکندر مرزا سے سماجی روابط تھے؟

جواب :- میں وزیر بننے سے قبل مسٹر اسکندر مرزا کو جانتا تھا۔ میری کبھی کبھار اُن سے ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ میں صدر اسکندر مرزا کی بیوی کو بھی جانتا تھا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ میری بیوی ایرانی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مسز اسکندر مرزا ایرانی تھیں۔

سوال :- کیا وزیر بننے سے پہلے آپ کسی منتخب عہدے پر فائز رہے تھے؟

جواب :- جب میں وزیر مقرر ہوا اس وقت انتخابات نہیں ہوئے تھے اس لیے میرے کسی منتخب عہدے پر فائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور سوال کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا کہ مجھے ۱۹۵۸ء میں وزیر بننے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا لیکن جب میں صدر اسکندر مرزا سے ملا تو میں نے انہیں بعض نکات سے آگاہ کیا تھا جن کی مجھے وضاحت مطلوب تھی۔ اُن کی اجازت سے میں (اُس وقت کے) جنرل محمد ایوب خان سے ملا اور اس بارے میں وضاحت کر لی تھی۔

سوال :۔ براہ مہربانی بتایئے کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ جب ۱۹۵۸ء میں آئین منسوخ کیا گیا تو ملک مندرجہ ذیل مسائل سے دوچار تھا : (۱) سیاسی عدم استحکام (۲) رشوت ستانی (۳) غربت (۴) افراد اور اُن کی املاک کا تحفظ (۵) بے خانماں افراد کی آبادکاری کا التواء (۶) سمگلنگ۔

جواب :۔ ملک کو یقیناً یہ مسائل درپیش تھے۔ میں قدرتی طور پر وزیر بننے کے بعد ان حالات کی مذمت کرتا رہا۔

سوال :۔ کیا یہ درست ہے کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر مسٹر یو۔ کرامت کی صدارت میں لاہور میں طلبا اور اساتذہ کے ایک جلسے سے "موجودہ حکومت کے مقاصد" کے موضوع پر خطاب کیا تھا؟

جواب :۔ مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا سے دو موقعوں پر خطاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اُن میں سے ایک ہو۔ میں اپنی یادداشت کی بنیاد پر یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا میں نے اس تقریر میں انقلاب کے فلسفے کی وضاحت کی تھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر بھٹو نے بتایا کہ یہ درست ہے کہ میں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اپنی تقریروں میں اس حکومت کی تعریف کی تھی لیکن جیسا کہ میں نے اپنے حلفی بیان میں لکھا ہے، ان دنوں مجھے دوسرے بہت

سے شہریوں کی طرح اس حکومت کے بارے میں خوش فہمیاں تھیں لیکن بعد میں میری اُمیدیں ختم ہوگئیں۔

سوال :۔ آپ کو پہلی مرتبہ کب اس بات کا احساس ہُوا کہ موجودہ حکومت ویسی نہیں جیسی آپ چاہتے تھے ؟

جواب :۔ جون ۱۹۶۱ء میں میں نے صدر ایوب کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ میری رائے میں میرے سمیت ساری کابینہ کو مستعفی ہوجانا چاہیئے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ میں اس وقت بھی صدر ایوب کی حکومت سے مایوس ہوچکا تھا۔ تاہم میں اپنی اس مایوسی کا برملا اظہار نہ کرسکا، کیونکہ میں مرکزی کابینہ کے رکن کی حیثیت سے مجبور تھا۔ لیکن اگست ۱۹۶۶ء میں جب میں حکومت سے الگ ہوا تو میں نے اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا شروع کردیا۔

سوال :۔ کیا یہ درست ہے کہ انقلاب سے قبل سابق صوبہ سندھ میں زمینداروں کے قبضے میں بہت زیادہ زمینیں تھیں ؟

جواب :۔ ہاں۔

سوال :۔ کیا آپ کی زمین ہاری کاشت کرتے تھے ؟

جواب :۔ ماسوائے اُن زمینوں کے جنہیں زمیندار اپنے ملازموں کے ذریعے کاشت کراتے ہیں۔ باقی زمینیں ہاری کاشت کرتے ہیں۔

بعد ازاں مسٹر بھٹو کو بعض ایل سی فارم دکھائے گئے جن پر ان کے (بھٹو صاحب) دستخط تھے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ چونکہ میں ذاتی طور پر اپنی، زمینوں کی دیکھ بھال نہیں کرتا اس لیے میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کتنی زمین ذاتی کاشت کے تحت تھی۔ بہرحال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ زمین ذاتی کاشت کے تحت تھی۔

اور ہمارے پاس اس مقصد کے لیے دو ٹریکٹر تھے۔

ٹریکٹر کیس کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا کہ چار کلکٹروں نے اس کی تحقیقات کیں اور اسے غلط قرار دیا تھا لیکن ان کلکٹروں کے فیصلے کی نقول مجھے فراہم نہیں کی گئیں۔ جب میں نے حکام بالا سے رجوع کیا تو انہوں نے مجھے نقول دینے کا حکم صادر کرنے کی بجائے دوبارہ تحقیقات کا حکم دیدیا۔

مسٹر بھٹو کی اراضی کے بارے میں سوالات کے دوران عدالت نے اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل قاضی اختر کو بار بار ٹوکا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ غیر متعلق سوال نہ پوچھیں۔ عدالت نے کہا کہ جو بات سرکاری ریکارڈ پیش کرنے سے ثابت ہو سکتی ہے وہ خواہ مخواہ مسٹر بھٹو سے کہلوانے کی ضرورت نہیں۔

فاضل ججوں کے استفسار پر ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر نے بتایا کہ اراضی کے بارے میں تمام ریکارڈ اُن کے پاس پہنچ چکا ہے۔ عدالت نے حکم دیا کہ یہ تمام ریکارڈ عدالت کے ریکارڈ میں شامل کیا جائے۔

مسٹر بھٹو پر جرح ابھی جاری تھی کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ اجلاس برخاست ہونے سے قبل میاں محمود علی قصوری نے عدالت سے استدعا کی کہ حلفی بیان کے وہ پیراگراف شائع کرنے کی اجازت دے دی جائے جنہیں ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی تحریری درخواست میں قابل اعتراض قرار نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیان حلفی کی اشاعت کے بغیر جرح کی کارروائی شائع ہونے سے لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہیں ہو سکے گا۔

عدالت نے یہ استدعا منظور نہیں کی اور کہا "ہم حلفی بیان کے ٹکڑوں میں اشاعت کی اجازت نہیں دے سکتے" عدالت نے وکیل صفائی کی یہ استدعا منظور کر لی کہ مسٹر بھٹو پر مزید جرح سے قبل اس اعتراض پر اُن کے دلائل کی سماعت کی جائے گی۔

قبل ازیں مسٹر بھٹو نے کہا کہ جب تک عدالت حلفی بیان پر ایڈووکیٹ جنرل کے

اعتراض کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرے اُن کے لیے سوالات کا جواب دینا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ موجودہ صورت میں وہ حلفی بیان میں شامل کسی خاص معاملے کا حوالہ دے سکتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ سارے کے سارے حلفی بیان کے بارے میں غور ہونا چاہیئے۔ اور اسے ایک ساتھ اخبارات میں چھپنا چاہیئے ورنہ بیان حلفی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مسٹر بھٹو نے عدالت سے استدعا کی کہ مجھے پاکستان پیپلز پارٹی کے قائم مقام چیئرمین مسٹر جے اے رحیم سے جیل میں ملنے کی اجازت دی جائے۔ میں اُن سے مشورہ کرنے کے بعد اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس فیصلے کی روشنی میں عدالت عالیہ کو حلفی بیان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ عدالت نے مسٹر بھٹو کو مسٹر جے اے رحیم سے ملنے کی اجازت دی۔ اور اجلاس اگلے روز تک کے لیے برخاست ہو گیا۔

۵ر فروری

عدالت کی کارروائی شروع ہونے پر سرکاری وکیل مسٹر اسماعیل بھٹی نے حلفی بیان کی اشاعت کی ممانعت کرنے کے سوال پر اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بیان حلفی میں صرف ایسے حقائق پیش کیے جا سکتے ہیں جنہیں حلیف ثابت کر سکتا ہو۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ شہادت زیر بحث حقائق کے سلسلے میں ہی پیش کی جا سکتی ہے اور اس مقدمے میں زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آیا مسٹر بھٹو مقبول ہیں یا نہیں۔

مسٹر اسماعیل بھٹی نے اس ضمن میں کئی مقدمات کے حوالے دیئے اور کہا کہ اگر نظر بند کا بیان قلمبند کیا جاتا تو وہ ایسی باتیں نہ کہتا جو انہوں نے اپنے حلفی بیان میں شامل کی ہیں۔ ملزم کو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے

کہ اُن کے خلاف الزامات غلط ہیں۔ اگر کوئی ملزم یہ کہے کہ وہ آئندہ ایسا جرم نہیں کریگا تو حکومت اپنی تسلی کرنے کے بعد اُسے رہا کر سکتی ہے۔ نظر بند نے اپنے حلفی بیان میں ملک میں موجودہ بگاڑ کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرایا ہے اور کئی فرضی واقعات بیان کیے ہیں۔ عدالت کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ نظر بند کرنے والی اتھارٹی کے روبرو جو مواد پیش کیا گیا تھا اس کی بنیاد پر نظر بندی حکم درست ہے یا نہیں اور آیا مذکرہ اتھارٹی نے پوری طرح تسلی کرنے کے بعد نظر بندی کا حکم جاری کیا ہے۔

میاں محمود علی قصوری نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ حلفی بیان کے دو پیراگرافوں یعنی پیرگراف نمبر ۱۵ اور ۱۶ کے سوا سرکاری وکیل کا یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ مقدمے میں بدنیتی پر مبنی ہونے کا الزام، اس تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ حلفی بیان کی کوئی بات اُس کے دائرے سے باہر نہیں۔ انہوں نے کہا کہ حلفی بیان میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں کیا گیا جو غیر متعلق ہو، اس کا ہر پیراگراف رٹ درخواست اور ضمنی وجوہ کے مطابق ہے۔

میاں محمود علی قصوری نے مزید کہا کہ حکومت نے نظر بند کو ہلالِ پاکستان دیتے وقت اس کی خدمات کو سراہا تھا لیکن جونہی نظر بند نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا حکومت کو اُس میں ہزاروں خامیاں نظر آنے لگیں اور وہ اس کے درپے ہو گئی۔ گذشتہ سال ستمبر میں جب مسٹر بھٹو نے حیدر آباد کی کنونشن میں یہ اعلان کیا کہ "مشرقی پاکستان سے کوئی متفقہ اُمیدوار سامنے نہ آیا تو میں خود صدارتی انتخاب لڑوں گا" تو حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی اور طرح طرح سے انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے حلفی بیان میں کیا ہے۔ مسٹر بھٹو کو نظر بند کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں عوام سے الگ کر دیا جائے اور

جو عوامی تحریک انہوں نے شروع کی تھی وہ اُن کی عدم موجودگی میں سرد پڑ جائے۔ اب نظر بند کے بیان حلفی کو غیر متعلق قرار دینے اور اس کی اشاعت روک دینے کی درخواست کا مقصد یہ ہے کہ نظر بند اپنی صفائی میں ان حالات کا ذکر نہ کرے جن کی وجہ سے حکومت نے اُن کے خلاف یہ کارروائی کی ہے۔

میاں محمود علی قصوری نے پیش کش کی کہ اگر بیان حلفی کے پیراگراف نمبر ۱۵ اور ۱۶ جو کشمیر اور خارجہ پالیسی سے متعلق ہیں، حذف کر دیئے جائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ انہوں نے نظر بندی کی تمام کارروائی کو بدنیتی کے تحت کی گئی کارروائی قرار دیا۔ حلفی بیان میں صدرِ مملکت کے تذکرے، نظر بند کو سیاست میں حصہ لینے سے روکنے اور دھمکی دینے کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت کو خوف ہے کہ حلفی بیان شائع ہونے سے یہ باتیں منظر عام پر آجائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ صدر مملکت کو نظر بند سے مقابلے کا خطرہ تھا اس لیے انہوں نے نظر بند کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

فاضل ججوں نے دلائل کی سماعت کے بعد یہ تبصرہ کیا کہ چونکہ ہوم سیکرٹری کے بیان حلفی کو شائع کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی اور کسی حصے کو حذف نہیں کیا گیا تھا اس لیے نظر بند کو بھی وہی آزادی ملنی چاہیئے۔ نظر بند کو، جسکی آزادی چھین لی گئی ہے، یہ حق حاصل ہے کہ وہ تفصیل سے وہ واقعات بیان کرے جن کی وجہ سے اُس کی آزادی سلب کی گئی ہے۔ نظر بند نے اپنا حلفی بیان شہادت کے طور پر پیش کیا ہے اور حکومت کے تمام الزامات کی تردید میں اُن کا پس منظر بیان کیا ہے۔ محض غیر متعلق حصّوں کی بنا پر کسی کے حلفی بیان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ اس میں اہانت آمیز مواد موجود ہو۔ نظر بند کو اس لیے نظر بند نہیں کیا گیا کہ وہ آئندہ حکومت کے خلاف سرگرمیاں کریں گے، انہیں

ایسی سرگرمیوں کی بنا پر نظر بند کیا گیا ہے جو وہ کر چکے ہیں۔ حکومت کو موجودہ ہنگاموں کا ذمہ دار ٹھہرانا نظر بند کا ذاتی نظریہ ہے اور ہر شخص کو اپنا نظریہ قائم کرنے کی آزادی ہے فاضل ججوں نے بیان حلفی کے پیراگراف نمبر ۱۵ اور ۱۶ کو حذف کرنے کا حکم دیا۔ جو وکیل صفائی نے خود حذف کرنے کی پیش کش کی تھی اور اخبارات کو باقی ماندہ حلفی بیان پورا چھاپنے کی اجازت دے دی۔

عدالت عالیہ کے اس حکم کے بعد اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل قاضی اختر نے مسٹر بھٹو پر دوبارہ جرح شروع کی۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر بھٹو نے بتایا "یہ صحیح ہے کہ میں ضلع جیکب آباد کے موضع راہجو میں تقریباً ۴۵۸ ایکڑ اراضی کا مالک تھا۔ ملک میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد مجھے اس رقبے میں سے تقریباً ۲۵۵ ایکڑ اراضی اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں نے باقی ماندہ رقبے کے کچھ حصے کا اپنے نابالغ بیٹے میر غلام مرتضیٰ کی اراضی سے تبادلہ کر لیا تھا۔ ڈپٹی لینڈ کمشنر نے اس سلسلے میں مجھے باقاعدہ اجازت دی تھی"۔

مسٹر بھٹو نے مزید کہا "میرے والد مرحوم نے تقریباً ۵ ہزار ایکڑ اراضی کا ایک وقف الاولاد ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ میں اس ٹرسٹ کی تقریباً نصف آمدنی کا حقدار تھا۔ میں اپنے سسر کی تیرہ ہزار ایکڑ اراضی کی آمدنی کا تیسرا حصہ دار تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنی والدہ کی پانچ سو ایکڑ اراضی میں بھی حصہ دار تھا"۔

سوال :۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اپنی جیکب آباد کی اراضی کے انتقال کے لیے واشنگٹن سے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھا تھا؟

اس مرحلے پر مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے کہا کہ اس مقدمے میں مسٹر بھٹو کی اراضی کا کوئی معاملہ فیصلہ طلب نہیں اس لیے غیر متعلق

سوال نہ کریں۔

مسٹر بھٹو نے فاضل عدالت سے کہا "جناب والا مجھے خوشی ہے کہ مجھے یہ سوالات پوچھے جا رہے ہیں میں ثابت کروں گا کہ اس سلسلے میں مجھ پر عائد کردہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ میں نے قانون کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی تھی۔"

مسٹر مشتاق حسین نے قرار دیا کہ یہ عدالت غیر متعلق سوالات کی اجازت نہیں دے سکتی۔

مسٹر بھٹو نے عدالت کو بتایا "جناب والا میں نے واشنگٹن سے خط اس لیے لکھا تھا کہ میرے منشی نے مجھے اطلاع دی تھی کہ انتقال اراضی کے بارے میں ۱۹۵۹ء میں جو فیصلہ ہوا تھا اس پر ۱۹۶۳ء تک عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔"

مزید سوالات کا جواب دیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا "ایک پولیس افسر کراچی میرے پاس آیا تھا اور اس نے میرے ہتھیاروں کی واپسی کا ذکر کیا تھا مگر میں نے اسے بتایا کہ مجھے ہائی کورٹ سے حکم امتناعی مل چکا ہے یہ افسر مجھے ہراساں کرنے کے لیے آیا تھا حالانکہ میں ہائی کورٹ کے حکم امتناعی کے بارے میں متعلقہ حکام کو اطلاع دے چکا تھا۔"

ایک سوال کے جواب میں بھٹو صاحب نے بتایا "لاڑکانہ میں شاہی بازار کا بہت سا حصہ آگ لگنے سے تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس بازار کے غریب دکانداروں کی از سر نو آبادکاری کے لیے چندے کی اپیل کی تھی اور خود بھی چندہ دیا تھا۔ یہ سارا چندہ ڈپٹی کمشنر کے پاس جمع ہوا تھا۔ اس چندے میں سے مارکیٹ کی تعمیر کے بعد جو رقم بچ گئی تھی اس سے میرے نام پر ایک خیراتی ٹرسٹ بنایا گیا تھا۔"

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "مجھے جیل میں اطلاع دی گئی تھی کہ مجھ پر اقدام قتل کے الزام میں ایک مقدمہ بنایا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ اطلاع غلط ہو۔

مجھ پر لاڑکانہ میں مسلح افراد نے مئی ۱۹۶۶ء میں حملہ کیا تھا مگر میں نے اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دی تھی اور نہ ہی فوجداری عدالت سے شکایت کی تھی کیونکہ مجھے انتظامیہ سے انصاف کی اُمید نہیں تھی۔"

ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر بھٹو نے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے خلاف ٹریبونل کیس میں ماخوذ بعض سرکاری ملازمین وعدہ معاف گواہ بن گئے ہیں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "ڈاکٹر بشیر حسن کے مکان کے باغ میں ہماری سٹیج کو آگ لگانے کا جو واقعہ ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی رپورٹ پولیس میں درج کرائی گئی تھی یا نہیں۔" ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "حیدر آباد میں میر رسول بخش تالپور کے مکان پر پیپلز پارٹی کی جو کنونشن ہوئی تھی اُس کے بعد مجھے ایک طالب علم مسٹر مسعود نورانی سے متعارف کرایا گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ طالب علم کنونشن میں موجود تھا یا نہیں۔"

بھٹو صاحب پر جرح ابھی جاری تھی کہ عدالت کی کارروائی اگلی صبح تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اسی شام پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن ڈاکٹر بشیر حسن نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ "مسٹر بھٹو کئی دن سے یہ سوچ رہے ہیں کہ اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست واپس لے کر تا مرگ بھوک ہڑتال کر دیں۔ بھٹو صاحب کا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں ہنگامی حالات ختم کر کے عوام کے بنیادی اور جمہوری حقوق بحال کیے جائیں۔"

صدر ایوب او گورنر موسیٰ کے خطوط

۱۷ فروری کو رٹ درخواست کی کارروائی شروع ہونے سے قبل اٹارنی جنرل پاکستان مسٹر شریف الدین پیرزادہ اور ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان راجہ سید اکبر نے، صدر ایوب اور گورنر مغربی پاکستان مسٹر محمد موسیٰ کے خطوط مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے خصوصی بنچ کے سامنے پیش کیے۔

اٹارنی جنرل مسٹر شریف الدین پیرزادہ نے عدالت سے کہا کہ کل عدالت عالی وقار نے مسٹر بھٹو کا بیان حلفی قبول کیا تھا۔ اس ضمن میں حقائق کی وضاحت کے لیے میں صدر ایوب کی طرف سے عدالت میں ایک خط پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ مسٹر پیرزادہ نے کہا کہ اس اقدام سے اس استثناء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جو آئین کے آرٹیکل ۱۱۶ کے تحت عدالتی کارروائی کے سلسلے میں صدر کو حاصل ہے۔

اس کے بعد مسٹر پیرزادہ نے مندرجہ ذیل خط پڑھ کر سنایا۔

ایوانِ صدر راولپنڈی
۵ر فروری ۱۹۶۹ء

منجانب:۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
(نشانِ پاکستان، ہلالِ جرأت)

ڈیر مسٹر پیرزادہ!

میری توجہ مسٹر زیڈ اے بھٹو کے اس حلفی بیان کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جو انہوں نے رٹ پٹیشن نمبر ۶۸/۱۷۹۴ کے ضمن میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں داخل کیا ہے۔

مذکورہ حلفی بیان میں مجھ سے بعض باتیں منسوب کی گئی ہیں جو سراسر غلط، جھوٹی اور بے بنیاد ہیں۔ یہ درپردہ چوٹیں، الزامات، دھمکیاں اور انتباہ مسٹر بھٹو کے اپنے تخیل کی پیداوار ہیں۔ میں نے کبھی کسی شخص کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ میری طرف سے مسٹر بھٹو کے پاس جائے اور انہیں کسی بھی طریقے سے سیاست میں داخل ہونے یا صدارتی انتخاب میں حصّہ لینے سے منع کرے۔ اس کے برعکس جب وہ کابینہ سے علیحدہ ہوئے تو میں نے انہیں نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

اگر آپ ضروری سمجھیں تو براہِ کرم مندرجہ بالا الفاظ عدالت عالی وقار تک پہنچا دیں۔

آپ کا مخلص
دستخط: محمد ایوب خان
(صدر پاکستان)

سید شریف الدین پیرزادہ
(ستارۂ پاکستان اٹارنی جنرل)

عدالت نے اٹارنی جنرل سے پوچھا کیا وہ اس خط کو ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔

اس کے بعد ایڈووکیٹ جنرل نے گورنر مغربی پاکستان مسٹر محمد موسیٰ کا مندرجہ ذیل خط پیش کیا:

نمبر جی ایس (بی) - ۶۹/۸۷

گورنر ہاؤس لاہور
۵ر فروری ۱۹۶۹ء

بنام:-
ایڈووکیٹ جنرل
مغربی پاکستان لاہور

میری توجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے اس حلفی بیان کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جو انہوں نے رٹ پٹیشن نمبر ۶۸/۱۷۹۴ کے ضمن میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ میں داخل کیا ہے۔ مجھ سے جو بیان منسوب کیا گیا ہے وہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ غلط ہے کہ میں نے مسٹر بھٹو کو "صلح کر لینے" یا تاشقند کے بارے میں کچھ نہ کہنے کا مشورہ دیا تھا۔ نہ ہی میں نے انہیں کسی قسم کی دھمکیاں دیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ میں نے ملتان کے مسلم لیگیوں سے کہا تھا کہ مسٹر زیڈ اے بھٹو کے خلاف تشدد کریں یا یہ کہ میں نے اس بات پر انہیں "سرزنش" کی تھی کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے اس علاقے کے دورے کے دوران اُن سے "مناسب" "سلوک" نہیں کیا۔ یہ بھی غلط ہے کہ میں نے مسٹر بھٹو کے خلاف غیر مہذب اور ہتک آمیز زبان استعمال کی۔ اگر آپ ضروری سمجھیں تو اسے عدالت کے علم میں لا سکتے ہیں۔

دستخط (محمد موسیٰ)
گورنر مغربی پاکستان

ایڈووکیٹ جنرل نے گورنر موسیٰ کا یہ خط ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے عدالت کو دے دیا۔

مسٹر بھٹو کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے عدالت سے کہا کہ انہیں حیرت ہے کہ اس قسم کے خط ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے عدالت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ان خطوں کو ریکارڈ میں شامل کرنے پر اعتراض کیا۔

عدالت نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احکامات لکھوائے:۔

"اس سے قبل کہ ہم آج کی کارروائی شروع کرتے فاضل اٹارنی جنرل کھڑے ہوئے اور انہوں نے صدر کا خط پڑھ کر سنایا جو اُن کے نام لکھا گیا تھا۔ اس خط کے آخر میں اُن سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اسے عدالت کو پہنچا دیں۔ مسٹر شریف الدین پیرزادہ نے استدعا کی ہے کہ یہ خط اس عدالت کے ریکارڈ میں شامل کر لیا جائے اور اس اقدام سے اس استثنا پر کوئی اثر نہ پڑے جو صدر کو آئین کے آرٹیکل ۱۱۶ کے تحت حاصل ہے۔ بہرحال ہمارے خیال میں استثنا کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ ہم صدر کو عدالت میں طلب نہیں کر رہے۔ آئین ہمیں ایسا کرنے سے روکتا ہے اس لیے اِس سے اُس استثنا پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو آئین کے تحت صدر کو حاصل ہے۔

۲۔ فاضل ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر خان نے بھی اسی طرح ایک خط پیش کیا ہے جو گورنر مغربی پاکستان نے انہیں بھیجا ہے اور انہوں نے اسے ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے ہمارے سپرد کر دیا ہے

۳۔ درخواست گزار کے فاضل وکیل مسٹر محمود علی قصوری کو ان دستاویزات کو ریکارڈ میں شامل کرنے پر اعتراض ہے اس لیے ان دستاویزات کو اس شرط کے ساتھ فائل میں رکھا جاتا ہے کہ میاں محمود علی قصوری بعد میں اس سلسلے میں اپنا اعتراض اور دلائل پیش کر سکیں گے۔

اس کے بعد عدالت نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی کمیٹی کے رکن ڈاکٹر بشر حسن کی گزشتہ روز کی پریس کانفرنس کے سلسلے میں اُن کا بیان قلم بند کیا۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا کہ اس پریس کانفرنس کی جو رپورٹ پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی ہے وہ انتہائی قابل اعتراض ہے۔ اس رپورٹ سے یہ تاثر لیا جا سکتا ہے کہ یہ عدالت مسٹر بھٹو کے مقدمے کو غیر معینہ عرصے کے لیے طول دے رہی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر بشر حسن کو اس عدالت میں باقاعدہ بیان دینا چاہیئے کہ انھوں نے ایسی بات کہی تھی یا نہیں۔

چنانچہ عدالت کے حکم کے مطابق ڈاکٹر بشر حسن کا مندرجہ ذیل بیان قلم بند کیا گیا۔

سوال:۔ کیا آپ نے کل اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ مسٹر بھٹو مقدمے کی کارروائی کے لیے غیر معینہ مدت تک انتظار نہیں کر سکتے؟

جواب:۔ میں نے ہرگز ایسی بات نہیں کی۔

سوال:۔ کیا آپ کا یہ تاثر ہے کہ ہم اس عدالت کی کارروائی میں تاخیر کر رہے ہیں؟

جواب:۔ نہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ اس عدالت میں قانونی کارروائی نہایت مستعدی سے انجام دی جا رہی ہے۔

اس موقع پر مسٹر بھٹو نے کھڑے ہو کر کہا " میں عدالت کا بے پناہ احترام کرتا ہوں۔ ڈاکٹر بشر حسن نے اس عدالت کی کارروائی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔" تاہم عدالت نے مسٹر بھٹو کا یہ بیان قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

فاضل ججوں نے حکم دیا کہ یہ تردید اخبارات میں صفحہ اول پر جلی حروف میں شائع کی جائے۔

جرح

جرح شروع ہونے سے قبل مسٹر بھٹو نے عدالت سے کہا کہ چار فروری کو انہوں نے استدعا کی تھی کہ انہیں ایک بیان دینے کی اجازت دی جائے۔ اگر یہ اجازت دے دی جاتی تو حلفی بیان کے بارے میں حکم جاری کرنے کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوتی۔ انہوں نے مزید کہا کہ گزشتہ دو روز کے دوران انہوں نے جرح کا سامنا کیا ہے اور آج بھی اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کے سوالوں کا جواب دیں گے۔ میری خواہش ہے کہ یہ مجھ پر جرح کریں تاکہ حقائق سامنے آجائیں، کل جب ان کی جرح ختم ہوگی تو میں اپنا بیان دوں گا جو قومی اہمیت کا حامل ہوگا اور جس کے بعد عدالت کی کارروائی ختم کرنا آسان ہوجائے گا

اس کے بعد اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل قاضی اختر نے مسٹر بھٹو پر جرح شروع کی:

سوال :- آپ نے ۱۹۶۱ء میں "ہمارے صدر اور انقلاب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو روزنامہ ڈان کی ۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

مسٹر بھٹو نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ اس کے بعد سرکاری وکیل نے مسٹر بھٹو کی تقریروں کے متعدد اخباری تراشے پیش کیے۔ مسٹر بھٹو نے تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ تقریریں کی تھیں۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کے متعدد سوالات رد کردیئے جو اُن کی خاندانی جائیداد کے بارے میں تھے۔ فاضل جج نے کہا "ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہوچکا ہے۔ ہم اس عدالت کا مضحکہ اڑانے کی اجازت نہیں دے سکتے"۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین

نے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر سے کہا کہ اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کو کئی مرتبہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ غیر متعلق سوالات پوچھ کر اس مقدمے کی کارروائی کو طویل کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن وہ ایسا کرنے پر مصر ہیں۔ اگر وہ قانونِ شہادت کی پابندی نہیں کر سکتے تو آپ خود جرح کریں یا یہ کام اپنے کسی دوسرے جونیئر کے سپرد کر دیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کو قانونِ شہادت کی مبادیات کا بھی علم نہیں۔

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے کہا: آپ کو قانونِ شہادت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ براہِ کرم متعلقہ سوالات پوچھئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سوالات عدالت کے ریکارڈ سے متعلق ہونے چاہئیں۔ عدالت میں حکومت کی بدنیتی زیرِ بحث ہے، مسٹر بھٹو کی نہیں۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے مزید کہا کہ ہم نے عدالت کو نظر بند کے لیے پروپیگنڈے کا ذریعہ بنانے کی اجازت نہیں دی اور عدالت کو حکومت کے پروپیگنڈے کے لیے بھی استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

اٹارنی جنرل مسٹر شریف الدین پیرزادہ اور ایڈووکیٹ راجہ سید اکبر نے عدالت عالیہ سے اتفاق کیا کہ اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کو ایسے سوالات نہیں پوچھنے چاہئیں جن کا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہیں۔ عدالت عالیہ اور اپنے اعلیٰ افسروں کے ان ریمارکس کے پیشِ نظر اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی جرح مختصر کر دی اور صرف ایسے سوالات پوچھے جن کا تعلق مسٹر بھٹو کی مبینہ قابلِ اعتراض تقریروں سے تھا۔

سوال :۔ کیا آپ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء کو حیدر آباد میں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ وہ وقت آئے گا جب خون خرابہ ہو گا؟

جواب :۔ میں نے حیدر آباد میں دو ڈھائی گھنٹے زبانی تقریر کی تھی۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ میں نے اصل میں کیا الفاظ استعمال کیے تھے، جہاں تک مجھے

یاد پڑتا ہے میں نے کہا تھا "تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے وقت میں خون خرابہ ہو سکتا ہے"۔

اس کے بعد عدالت نے اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کا ایک اور سوال رد کر دیا جو مذکورہ تقریر کے ایسے حصے سے تعلق رکھتا تھا جس پر ہوم سیکرٹری نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے تسلیم کیا کہ انہوں نے اپنی اس تقریر کے دوران آستینیں چڑھائی تھیں۔

سوال :۔ کیا آپ نے کوہاٹ میں اپنی تقریر میں یہ کہا تھا "اگر تم سے یہ مسئلے ختم نہیں ہوتے تو نکل جاؤ ہمیں آنے دو۔ یہ کیا بکواس ہے دس سال سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ اگر آپ نہیں چھوڑیں گے تو ہم زور سے چھڑا لیں گے۔

جواب :۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ نہیں چھوڑیں گے تو عوام آپ کو باہر نکال دیں گے۔

سوال :۔ کیا آپ نے اپنی اس تقریر میں کہا تھا "میرے پاس پستول نہیں ہم اپنے بھائیوں مزدوروں، طلبا اور کسانوں سے کام لیں گے"

جواب :۔ یہ صحیح ہے۔ میں نے یہی کہا تھا۔

سوال :۔ کیا آپ نے چارسدہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پختون قوم میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے۔ ہم اپنے بدلے کبھی نہیں چھوڑتے ہم ہمیشہ انتقام لیتے ہیں؟

جواب :۔ میں نے یہ الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ میں نے یہ کہا تھا "پٹھان انتقام لیتے ہیں اور ہمارے علاقے کے لوگ بھی انتقام لیتے ہیں"

ایک اور سوال کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا کہ کوہاٹ کے اجتماع میں تقریباً بارہ سو افراد تھے۔ سامعین میں طلبا بھی شامل ہوں گے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ صدر ایوب نے ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو پشاور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا تھا اور اس جلسے میں گولیاں چلائی گئی تھیں۔

ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لاہور میں ۱۰ر نومبر کو اپنی تقریر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا "میری تقریر کا موضوع پاکستان کی خارجہ پالیسی تھا۔ یہ غلط ہے کہ اس جلسے میں مجھے طلبا کے تشدد کی مذمت کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری تقریر کے آخر میں کسی نے پیچھے سے کہا تھا کہ میں طلبا کی جدوجہد کے بارے میں کچھ کہوں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ طلبا اپنے جائز حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں انہیں ایسا کرنے سے نہیں روک سکتا"

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ ۵ر اکتوبر کو پشاور گئے تھے۔

ڈیرہ اسماعیل خاں کے دورے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دو پانچ چھ آدمی میرے ساتھ تھے جو کاروں میں سفر کر رہے تھے۔ میرا استقبال کرنے کے لیے سڑک پر عوام کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے دفتر میں جانا چاہتا تھا۔ چونکہ راستے میں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا اس لیے مجھے پارٹی کے دفتر کے بالمقابل ایک اور عمارت میں جانا پڑا۔ میں اس بلڈنگ کی بالکونی میں بھی گیا۔ مسٹر حق نواز گنڈاپور اس وقت میرے ساتھ نہیں تھے اس لیے اُن کے وہاں بندوق بلند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ڈیرہ اسماعیل خان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ہیں اور اُس وقت پارٹی کے دفتر میں میرا انتظار کر رہے تھے۔

سوال:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ۱۲ر ستمبر کو حیدر آباد میں آپ کی تقریر کے بعد سے ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء تک کے عرصے کے دوران طلبا نے ہنگامے برپا کیے جن میں تشدد کی

کارروائیاں کی گئیں ۔

جواب :۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس عرصے کے دوران کراچی میں طلبا نے ہنگامے کیے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس عرصے کے دوران سارے ملک میں طلبا اٹھ کھڑے ہوئے تھے ۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا " یہ غلط ہے کہ جب میں ڈیرہ اسماعیل خان میں عمارت کی بالکونی میں آیا تو وہاں فساد ہو گیا تھا ۔"

ایک اور سوال کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا، ضمنی وجوہ اور بیان حلفی میں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے ۔ درحقیقت میں نے ان دستاویزات میں بھی پوری تفصیل بیان نہیں کی ۔

اس سوال کے بعد اڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کی مسٹر بھٹو پر جرح مکمل ہو گئی ۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل سے پوچھا کہ کیا کوئی اور سرکاری وکیل مسٹر بھٹو پر جرح کرے گا ۔ ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ ان پر مزید جرح نہیں کی جائے گی ۔

ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت سے استدعا کی کہ وہ بعض سرکاری افسروں کے حلفی بیان داخل کرنا چاہتے ہیں جن کا مسٹر بھٹو کے حلفی بیان میں تذکرہ کیا گیا ہے ، اس مقصد کے لیے انہیں کچھ وقت درکار ہے ۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل سے استفسار کیا کہ کہ انہیں کس قدر وقت درکار ہے ۔ ایڈووکیٹ نے کارروائی آئندہ منگل تک ملتوی کرنے کی درخواست کی ۔

بنچ کے سینئر جج مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے ایڈووکیٹ جنرل سے کہا " آپ کو مسٹر بھٹو کے حلفی بیان کی نقل سماعت شروع ہونے سے بہت پہلے دے دی گئی تھی ۔ اور متعلقہ لوگوں کے حلفی بیان تیار کرنے کے لیے آپ کے پاس خاصا وقت تھا ۔ حلفی بیان اور جلیف جرح ختم ہوتے ہی عدالت میں موجود ہونے چاہئیں تھے ۔ کیا

آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ دو ماہ تک جرح جاری رکھیں گے۔"

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے مزید کہا کہ حلفی بیان اور حلیف جرح کے لیے کل عدالت میں موجود ہونے چاہییں۔ کل کے بعد عدالت اس مقصد کے لیے مزید وقت نہیں دے گی اور مقدمہ آگے بڑھائے گی اور دلائل کی سماعت کرے گی۔

فاضل جج نے مزید کہا "ہم مقدمے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے عبوری حکم جاری کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اس کے بعد عدالت کا اجلاس اگلے روز تک کے لیے ملتوی ہوگیا۔

تا دمِ مرگ بھوک ہڑتال کا فیصلہ

۷ فروری کو مسٹر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت شروع ہوئی تو ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان نے وزارت امور داخلہ اور کشمیر کے سیکرٹری مسٹر اے بی اعوان، ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو حکومت پاکستان مسٹر این اے رضوی، اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ مسٹر محمد انور آفریدی کے حلفی بیانات عدالت میں پیش کیے۔

مسٹر اعوان کا حلفی بیان

مسٹر اے بی اعوان نے اپنے حلفی بیان میں کہا

(۱) مسٹر بھٹو نے اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی تائید میں جو حلفی بیان پیش کیا اس کے پیراگراف ۲۴ اور ۲۵ میں مجھ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، وہ درست نہیں ہیں حقائق وہ ہیں جو مندرجہ ذیل پیراگرافوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) اکتوبر ۱۹۶۶ء کی کسی تاریخ کو مجھے فرنٹیئر کانسٹیبلری پشاور کے کمانڈنٹ مسٹر انور آفریدی کا ایک پیغام موصول ہوا جس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا آئندہ چند روز کے دوران میں راولپنڈی میں موجود رہوں گا کیونکہ مسٹر بھٹو جو کابل کے راستے وطن واپس آ رہے ہیں مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہیں میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس زمانے میں

مسٹر انور آفریدی کے چچا جنرل یوسف کابل میں پاکستان کے سفیر تھے۔ چند روز کے بعد مسٹر بھٹو راولپنڈی آئے اور مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ چونکہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے اس لیے میں نے انہیں اور ان کی بیگم کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہ غلط ہے کہ اس ملاقات کے دوران میں نے مسٹر بھٹو کو کسی قسم کا کوئی عہدہ قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی درست نہیں کہ میں نے انہیں کسی قسم کی دھمکی دی۔

(۳) ۲۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو میں تقریباً دو بجے سہ پہر کراچی پہنچا اور اگلی صبح تہران روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے بہت سے کام کرنے تھے۔ جن میں متعدد دوستوں اور ساتھیوں سے ملاقاتیں شامل تھیں۔ ۲۸ ستمبر کی شام کو ان میں سے دو افراد سندھ کلب میں تھے۔ یہ سنیچر کی شام تھی اور جب میں سندھ کلب میں گیا تو وہاں تقریباً ایک سو افراد تھے۔ میں وہاں بہت سے لوگوں سے ملا جن میں مسٹر اور مسز زیڈ اے بھٹو بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سوشل اجتماع میں حیدرآباد کے جلسے کے بارے میں اُن کا اپنا موقف پوچھا تھا جو ایک ہفتہ قبل ہوا تھا۔ میں اس جلسے کی سرکاری رپورٹ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ میں نے اُن سے یہ پوچھا تھا کہ آیا اُن کا صدارتی انتخاب لڑنے کا فیصلہ ناقابل تنسیخ ہے۔ نہ ہی میں نے اس سلسلے میں کوئی اور بات پوچھی تھی۔

(۴) مجھے کسی شخص نے اس کام پر مامور نہیں کیا تھا کہ مسٹر بھٹو کو بعض تجاویز پیش کروں یا اُن سے کچھ معلومات حاصل کروں۔

مسٹر رضوی کا حلفی بیان

مسٹر این اے رضوی نے اپنے حلفی بیان میں کہا

(۱) مئی ۱۹۶۷ء میں کراچی یا کسی اور جگہ مسٹر زیڈ اے بھٹو سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔

(۲) گذشتہ دس سال سے میں مسٹر بھٹو کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور چند موقعوں پر میری اُن سے غیر رسمی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ بہرحال یہ درست نہیں کہ میں نے لاہور، کراچی یا کسی دوسری جگہ پر کسی ملاقات میں اُن سے یہ کہا تھا کہ صدر کو ۱۹۷۰ء میں مزید پانچ سال کی مدّت کے لیے منتخب ہونا چاہیئے۔ یہ بھی درست نہیں کہ میں نے اگست ۱۹۶۸ء میں انہیں ایک پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ حکومت پر نکتہ چینی نرم کر دیں تو اُن کے خلاف مقدمات واپس لے لیے جائیں گے۔

مسٹر آفریدی کا حلفی بیان

مسٹر انور آفریدی نے اپنے حلفی بیان میں کہا۔۔۔ مسٹر بھٹو کے حلفی بیان کے (جو انہوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی تائید میں داخل کیا ہے) پیراگراف نمبر ۲۴ میں مندرج یہ الزام درست نہیں ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں پشاور کے ہوائی اڈے پر میں انہیں اس لیے ملنے گیا تھا کہ اُن سے اس بات کی تصدیق کر دوں کہ انہوں نے مسٹر اے بی اعوان کی جو اُس وقت ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو تھے اور اب وزارتِ داخلہ و امور کشمیر کے سیکرٹری ہیں، یہ دعوت قبول کر لی ہے کہ وہ راولپنڈی میں قیام کے دوران اُن کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔

(۳) اصل حقیقت یہ ہے کہ میرے چچا لیفٹننٹ جنرل محمد یوسف خان نے جو اُس وقت افغانستان میں پاکستان کے سفیر تھے، ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دی تھی کہ مسٹر بھٹو راولپنڈی میں اپنے قیام کے دوران مسٹر اے بی اعوان سے ملنا چاہتے ہیں۔ اُن کی ٹیلی فون کال کے مطابق میں نے مسٹر اعوان سے استفسار کیا تھا کہ آیا وہ مسٹر بھٹو سے ملنے کے لیے راولپنڈی میں موجود ہوں گے۔ مسٹر اعوان نے اس کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ اور میں نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں پشاور کے ہوائی اڈے پر مسٹر بھٹو کی

آمد پر انہیں یہ اطلاع پہنچا دی تھی"

حلفی بیانات کے ریکارڈ میں شامل ہو جانے کے بعد میاں محمود علی قصوری نے عدالت سے کہا کہ ان حلفی بیانات کی نقول کل رات ایڈووکیٹ جنرل نے مسٹر بھٹو کو دی تھیں۔ ابھی تک مجھے ان پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں جرح کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے عدالت سے استدعا کی بھٹو صاحب کو گواہوں پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت سے اجازت ملنے کے بعد بھٹو صاحب نے سب سے پہلے مسٹر انور آفریدی پر جرح شروع کی۔

سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مسٹر انور آفریدی نے کہا "یہ درست ہے کہ جب میں اکتوبر ۱۹۶۶ء میں پشاور کے ہوائی اڈے پر نظر بند سے ملا تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ پشاور کلب چلیں۔ وہاں ہم تقریباً نصف گھنٹہ ٹھہرے۔ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ آیا نظر بند کابل میں لیفٹننٹ جنرل محمد یوسف خاں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے"

"جب میرے چچا جنرل یوسف نے کابل سے مجھے ٹیلی فون کیا اور اطلاع دی کہ بھٹو صاحب مسٹر اے بی اعوان سے ملنے کے خواہش مند ہیں تو انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بھٹو صاحب اس وقت کابل میں تھے لیکن انہوں نے اس امر کا ذکر نہیں کیا کہ وہ اُن کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے"

بہر حال مجھے معلوم تھا کہ بھٹو صاحب اس وقت حکومتِ افغانستان کے مہمان تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کابل کے محل میں مقیم تھے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ جنرل یوسف اور مسٹر بھٹو میں سے پہلے کس نے دوسرے سے رابطہ قائم کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ اگر وہ مسٹر اے بی اعوان کی دعوت

قبول کر سکیں تو اچھی بات ہوگی۔

سوال:- کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ مجھے محض اس لیے پشاور کلب لے گئے کہ مجھے دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں اور اس کی کوئی اور وجہ نہیں تھی۔

جواب:- میں بھٹو صاحب کو اس لیے پشاور کلب لے گیا تھا کہ وہ اخباری نمائندوں کو انٹرویو دینے سے بچنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین نہیں کہ دوسری صورت میں وہ ہوائی اڈے پر اخباری نمائندوں سے بچ کر نکل سکتے تھے۔

اس کے بعد بھٹو صاحب نے این اے رضوی پر جرح شروع کی۔ ایک سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے بتایا کہ وہ مسٹر بھٹو کے وزیر بننے کے بعد اُن سے واقف ہوئے تھے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء کے وسط تک صوبائی حکومت کے ملازم تھے۔ اس کے بعد ان کی خدمات مرکزی حکومت کے سپرد کر دی گئیں اور وہ اب تک وہیں ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ صوبائی حکومت کی ملازمت کے دوران ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنیس کے طور پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا کہ اُن کا نظر بندی سے کوئی براہِ راست کوئی واسطہ نہیں تھا کیونکہ اُن کے پاس کبھی وزارت داخلہ کا قلمدان نہیں رہا۔

ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے بتایا کہ ڈی آئی جی خیر پور رینج کی حیثیت سے انہیں مسٹر بھٹو کے دورے کے پروگرام ملتے تھے۔ اُن دنوں بھٹو صاحب وزیر تھے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جن دنوں وہ ڈی آئی جی خیر پور رینج تھے جب کبھی مسٹر بھٹو اپنے آبائی شہر لاڑکانہ آیا کرتے تھے وہ (مسٹر رضوی) سکھر ریلوے سٹیشن پر اُن کا استقبال کیا کرتے تھے۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے کہا کہ اگرچہ اُن کی مسٹر بھٹو سے رسمی ملاقاتیں نہیں ہوتی تھیں لیکن وہ غیر رسمی طور پر اُن سے ملتے رہتے تھے اور اُن سے ہدایات لیتے تھے۔

مسٹر رضوی نے تسلیم کیا کہ وہ مسٹر بھٹو سے ملنے کے لیے کبھی لاڑکانہ نہیں گئے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جب مسٹر بھٹو وزیر تھے۔ مسٹر بھٹو اور اُن کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جتنا عرصہ مسٹر بھٹو وزیر رہے "ہم ایک دوسرے سے اکثر و بیشتر نہیں ملا کرتے تھے"

انہوں نے یہ بھی کہا جب مسٹر بھٹو کابینہ کے رکن نہ رہے تو میری اُن سے پانچ چھ مرتبہ ملاقات ہوئی۔ جن دنوں وہ وزیر تھے میں اُن سے تقریباً دس مرتبہ ملا تھا۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر رضوی نے کہا کہ مسٹر بھٹو کے حکومت سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ انہیں دو مرتبہ فلیٹیز ہوٹل میں ملے۔ ایک ملاقات اس کمرے میں ہوئی جو مسٹر بھٹو کا مخصوص کمرہ تھا جبکہ دوسری مرتبہ انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک علیحدہ کمرہ کرائے پر لیا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ انہوں نے دو مرتبہ کراچی میں مسٹر بھٹو کی قیام گاہ میں رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھایا۔

اس مرحلے پر بھٹو صاحب نے ملاقات کے لیے علیحدہ کمرہ لینے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ فلیٹیز میں اُن کا مخصوص کمرہ "محفوظ" نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے لوگوں سے ملنے کے لیے ایک اور کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہیں اُن کی مسٹر رضوی سے ملاقات ہوئی۔

مسٹر رضوی نے جرح کے دوران مزید بتایا کہ وہ ایک خاص قسم کے رنگ یا مادے سے الرجک ہیں۔ اس کو چھونے سے انہیں تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کے

چہرے کا رنگ سُرخ ہو جاتا ہے اور حالت غیر ہو جاتی ہے ۔ انہوں نے کہا : جس مادے کو چھونے سے مجھے بیماری کے عود کرنے کا خطرہ ہوتا ہے یا تو میں اُسے سرے سے چھوتا ہی نہیں یا دستانے پہن کر چھوتا ہوں ۔ میری جیب میں ہر وقت سفید دستانے رہتے ہیں ۔"

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ درست نہیں ہے کہ جب میں مسٹر بھٹو سے ہوٹل کے کمرے میں ملا تو میرے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ۔ انہوں نے کہا اُس وقت میں نے دستانے پہن رکھے تھے ۔

سوال :۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ نے مجھے کہا کہ مارشل لاء کے نتیجے میں جو لیڈر اُبھرے ہیں ، آپ اُن میں سے دو آدمیوں جنرل اعظم خاں کا اور میرا بہت احترام کرتے ہیں ۔

جواب :۔ میں نے ایسی بات نہیں کی تھی ، میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مسٹر بھٹو مارشل لاء کے نتیجے میں ایک لیڈر کی حیثیت سے اُبھرے ہیں ۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے کہا کہ فلیٹیز ہوٹل میں ایک ملاقات کے دوران مسٹر بھٹو اور انہوں نے ملک کی سیاسی صورتِ حال پر بات چیت کی تھی ۔ دونوں میں اس بات پر اتفاق تھا کہ اپوزیشن میں انتشار پھیلا ہوا ہے ۔

انہوں نے مزید کہا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں بتایا تھا کہ اپوزیشن کے بعض لیڈر انہیں میدان سے باہر نکالنے کے خواہش مند ہیں لیکن وہ گول باغ کے جلسۂ عام میں ، جس سے وہ خطاب کرنے والے ہیں ، اپنی حیثیت کا مظاہرہ کریں گے ۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا انہوں نے مسٹر بھٹو کو پارٹی بنانے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی ۔ مسٹر رضوی نے کہا کہ میں نے مسٹر بھٹو سے کہا تھا کہ سیاسی پارٹی بنانا بڑا مشکل کام ہے اور جنرل اکبر خان کی مثال پیش کی تھی جن کے بے پناہ اثر

کے باوجود ان کی پارٹی قدم نہ جما سکی۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے کہا کہ وہ لاہور کے ایڈووکیٹ شیخ صفدر علی کو جانتے ہیں جو پہلے پولیس کے محکمے میں رہے ہیں انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ جب بھی مسٹر بھٹو سے ملنے گئے شیخ صفدر علی اُن کے ساتھ آتے رہے۔ تاہم وہ بات چیت میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر رضوی نے کہا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ میں گذشتہ سال اگست میں لاہور میں تھا۔ تاہم میں اکثر لاہور آتا رہتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ گذشتہ سال بھٹو صاحب نے لاہور میں اپنی پارٹی کی کنونشن منعقد کی تھی، البتہ مجھے یہ یاد نہیں کہ یہ کنونشن کس تاریخ کو ہوئی تھی"

سوال :- کیا یہ درست ہے کہ آپ نے اس کنونشن کے موقع پر مجھے شیخ صفدر علی کے ذریعے پیغام بھیجا تھا۔ یہ کنونشن ۲۴ر اگست ۱۹۶۸ء کو لاہور میں ہوئی تھی اور آپ لاہور میں آئے ہوئے تھے۔

جواب :- جہاں تک پیغام ارسال کرنے کا تعلق ہے میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ پیغام میں نے کنونشن کے بعد بھیجا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر رضوی نے کہا "یہ غلط ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کو شیخ صفدر علی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ حکومت پر نکتہ چینی نرم کر دیں تو اُن کے خلاف ٹریکٹر کیس اور دوسرے مقدمات واپس لیے جا سکتے ہیں"۔

اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے مسٹر رضوی پر جرح ختم کر دی اور مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر اے بی اعوان پر جرح شروع کی۔

ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر اعوان نے کہا کہ وہ بھٹو صاحب کو وزیر بننے

سے قبل دو مرتبہ ملے تھے۔ پہلی ملاقات کراچی میں ایوان صدر میں ہوئی تھی اور دوسری مرتبہ لاہور میں پولیس کی ایک تقریب کے موقع پر۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو کے وزیر بننے سے قبل "ہم ابھی ایک دوسرے کے دوست نہیں بنے تھے"

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ شکار کے شوقین ہیں۔ اور انھوں نے سُنا تھا کہ لاڑکانہ میں بڑا شکار ملتا ہے لیکن وہ کبھی شکار کھیلنے کے لیے وہاں نہیں گئے۔

مسٹر اعوان نے کہا کہ وہ ۱۹۶۱ء میں ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو مقرر کیے گئے تھے۔ اور سوا چھ سال اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو کے عہدے پر فائز رہنے کی عام میعاد تین یا چار سال ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر اعوان نے کہا کہ ۱۹۶۶ء کے وسط میں مسٹر بھٹو کابینہ سے علیحدہ ہونے کے بعد یورپ کے دورے پر گئے تھے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ اور جنرل یوسف آپس میں گہرے دوست ہیں۔

مسٹر اعوان نے کہا کہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ بھٹو صاحب اکتوبر میں غیر ملکی دورے سے واپسی کے بعد راولپنڈی ہوٹل فلیش مین میں ٹھہرے۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ فلیشمین ہوٹل میں مجھے ملنے آئے جب میں اکتوبر ۱۹۶۶ء میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

جواب:۔ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں اس بات کی بھی تردید کرتا ہوں کہ میں مسٹر بھٹو سے ملا اور یہ کہ اس وقت وہ فلیشمین ہوٹل کے تیراکی کے تالاب کے کنارے مسٹر

الطاف حسین مرحوم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جو اُن دنوں وزیرِ صنعت و قدرتی وسائل تھے۔

سوال:۔ میں کہتا ہوں کہ نہ صرف آپ فلیشمین ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے بلکہ مجھے یہ بھی بتایا کہ چونکہ آپ راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اس لیے آپ میرے لیے اپنی کار بھیج دیں گے۔

جواب:۔ میری یادداشت کے مطابق مسٹر بھٹو نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ اور میں نے انہیں کہا تھا کہ وہ میرے ہاں آئیں اور کھانا کھائیں۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ آیا انہیں ٹرانسپورٹ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ انہیں کار کی ضرورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بھٹو صاحب اس سے پہلے کبھی میرے اس مکان میں نہیں آئے تھے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ میں نے ان کی کار کی رہنمائی کے لیے اپنی کار بھیجی تھی۔ میرا گھر بڑی سڑک پر ایسی جگہ ہے جہاں آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے بھٹو صاحب کی رہنمائی کے لیے اپنا ایک آدمی کھڑا کر دیا تھا۔ میرے گھر میں رات کے کھانے پر صرف بھٹو صاحب اُن کی بیگم اور میں اور میری بیگم موجود تھے۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر اعوان نے کہا کہ وہ مسٹر اقبال شعبان کو جانتے ہیں جو چیئرمین سروس کمیشن مسٹر نذیر احمد کے برادرِ نسبتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مسٹر نذیر احمد اور ان کے تعلقات اچھے ہیں۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر اعوان نے اس بات کی تردید کی کہ انہوں نے کبھی مسٹر اقبال شعبان کو مسٹر بھٹو کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ میں مسٹر نذیر احمد کو ۲۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کی شام کو ملا تھا اور سندھ کلب کراچی جانے سے قبل رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھایا تھا۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے میں وہاں سے

سیدھا سندھ کلب گیا لیکن یہ امکان مسترد نہیں کر سکتا کہ سندھ کلب جانے سے پہلے میں قصرِ ناز بھی گیا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔"

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ اُس وقت مسٹر نذیر احمد کے پاس تھے جب انہوں نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی اور کہا کہ میں آپ سے ملنے کے لیے سندھ کلب پہنچوں۔ اس سے پہلے میں اس سلسلے میں مسٹر اقبال شعبان کی درخواست مسترد کر چکا تھا اور اُنہوں نے ٹیلی فون پر مسٹر نذیر احمد کو اس بات کی اطلاع دے دی تھی۔

جواب:۔ اُس شام کے تمام واقعات کے بارے میں میری یادداشت یہ کہتی ہے:

"میں مسٹر نذیر احمد کے گھر گیا کیونکہ میں جب بھی کراچی جاؤں اُن کے ہاں ضرور جاتا ہوں۔ مجھے اُن کے گھر سے متعدد ٹیلی فون کرنے تھے۔ پہلا ٹیلی فون میں نے ڈی آئی جی کراچی پولیس مسٹر تزین کو کیا کیونکہ میں ایک سرکاری کام کے سلسلے میں اُن سے ملنا چاہتا تھا۔ ٹیلی فون کرنے پر پتہ چلا تھا کہ ڈی آئی جی اُس وقت سندھ کلب میں ہیں۔ میں نے دوسرا ٹیلی فون اقبال شعبان کو کیا۔ وہ اس وقت گھر میں تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی سندھ کلب جا رہے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں مسٹر نذیر احمد کے گھر سے سندھ کلب روانہ ہوا اور رات ۹ بجے کے بعد وہاں پہنچا۔ سب سے پہلے میری ڈی آئی جی پولیس مسٹر تزین سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد میں مسٹر اقبال شعبان اور متعدد دوسرے لوگوں سے ملا۔ میں مسٹر اور مسز بھٹو سے بھی ملا اور ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

جب میں مسٹر نذیر احمد کے گھر میں تھا تو وہ ٹیلی فون پر سندھی میں باتیں کر رہے تھے اس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسٹر اقبال شعبان سے گفتگو کر رہے تھے یا مسٹر بھٹو سے۔ میں سندھی نہیں جانتا۔ میں پنجابی ضرور جانتا ہوں، لیکن یہ میری مادری

زبان نہیں ہے۔

اس مرحلے پر مسٹر بھٹو نے کہا مسٹر نذیر احمد نے بات چیت کے دوران آخر میرا نام بھی تو لیا ہوگا اور نام کو خواہ کسی زبان میں بھی بولیں وہ نام ہی رہے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو جس زبان میں بھی بولیں اسی طرح بولا جائے گا۔ اگر کوئی شخص زبان نہ بھی جانتا ہو تو نام سمجھ سکتا ہے۔

مسٹر اعوان نے کہا کہ وہ اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ اگر کوئی سندھی میں باتیں کر رہا ہو اور مسٹر بھٹو کا نام لیا جائے تو اُسے سمجھیں گے

ایک سوال کے جواب میں مسٹر اعوان نے کہا کہ یہ درست ہے کہ جب ہم سندھ کلب میں ملے تو ہم نے سیاست پر بات چیت کی تھی اور اس دوران بھٹو صاحب کی حیدرآباد کی تقریر بھی زیرِ بحث آئی ہوگی۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ راولپنڈی میں میرے مکان میں رات کے کھانے کے بعد خواتین یقیناً دوسرے کمرے میں چلی گئی ہوں گی جبکہ میں اور بھٹو صاحب اکٹھے بیٹھے رہے۔ مجھے قطعی طور پر یاد نہیں کہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں راولپنڈی میں میرے مکان میں مسٹر بھٹو اور میرے درمیان کیا بات چیت ہوئی لیکن ہم نے یقیناً سیاست پر بات چیت کی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے نظر بند کو مشورہ دیا کہ وہ بدستور پاکستان مسلم لیگ میں رہیں۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ نے اپنے مکان میں بات چیت کے دوران مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں اگر مسلم لیگ میں رہوں، صدر کے مشیر کے طور پر کام کروں اور غیر ممالک کے لیے صدر جو فرائض میرے سپرد کریں، انجام دوں تو یہ بڑی مناسب اور اچھی بات ہوگی۔

جواب:۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ایسا کیا ہو لیکن اگر میں نے یہ تجویز پیش کی ہو تو میں

اسے ایک اچھا مشورہ سمجھتا ہوں"

اس پر مسٹر بھٹو نے مسٹر اعوان پر جرح ختم کر دی۔

اس سے پہلے میاں محمود علی قصوری نے عدالت کی توجہ گذشتہ روز موصول ہونے والے صدر مملکت اور صوبائی گورنر کے خطوط کی طرف مبذول کرائی اور کہا کہ اٹارنی جنرل نے صدر کا خط پیش کرتے وقت کہا تھا کہ آئین کے تحت صدر مملکت عدالت میں حاضر ہونے سے مستثنیٰ ہیں لیکن جہاں تک صوبائی گورنر کے خط کا تعلق ہے، ایڈووکیٹ جنرل نے یہ درخواست نہیں کی کہ صوبائی گورنر کو آئین کے تحت حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہ درست ہے کہ آئین میں ان شخصیتوں کو مستثنیٰ قرار دیا جا چکا ہے لیکن صدر اور گورنر نے یہ خطوط رضاکارانہ طور پر عدالت میں پیش کیے ہیں۔ اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر عدالت کے سامنے پیش ہوں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو اُن کے خطوط کو بھی مقدمے کے ریکارڈ میں شامل کرنے کی درخواست قبول نہ کی جائے۔ مسٹر قصوری نے کہا کہ صدر اور گورنر کو رضاکارانہ طور پر عدالت میں آکر بھٹو صاحب کی جرح کا سامنا کرنا چاہیے۔

فاضل ججوں نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ صدر اور گورنر کے قانونی مشیر موجود ہیں۔ جو اُن کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں۔ یہ مشورہ دینا ہمارا کام نہیں۔ اس کے علاوہ ہم اُن کو طلب کرنے کے لیے سمن بھی جاری نہیں کر سکتے۔ صدر اور گورنر کے خطوط کی حیثیت ایسے کاغذات کی ہے جو ریکارڈ میں شامل ہیں۔ انہوں نے وکیل صفائی سے کہا کہ وہ دلائل کے دوران اس نکتہ پر بھی بحث کر سکتے ہیں۔

مسٹر انور آفریدی، مسٹر رضوی اور مسٹر اعوان پر جرح مکمل ہو جانے کے بعد عدالت کا اجلاس چائے کے وقفہ کے لیے برخاست ہو گیا۔ جب سماعت دوبارہ شروع ہوئی تو عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل سے کہا کہ وہ اپنے دلائل شروع کریں۔

اس مرحلے پر بھٹو صاحب جنہوں نے ایک روز پہلے یہ کہا تھا کہ آج وہ ایک اہم بیان دیں گے اٹھے اور عدالت سے ایک بیان پیش کرنے کی اجازت مانگی۔

عدالت نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ آیا یہ بیان مقدمہ سے متعلق ہے تو بھٹو صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ بیان قومی مفاد کے بھی مطابق ہے۔

بھٹو صاحب نے عدالت کو بتایا کہ وہ اپنا مقدمہ واپس لینے کی اجازت حاصل کرنے کی وجوہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

رٹ پٹیشن واپس لینے کی وجوہات

"ماضی تاریخ کا حصہ ہے جن واقعات نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا انہیں جنم دینے کا سہرا خواہ کوئی اپنے سر باندھے اس سے فرق نہیں پڑتا سیاسی حالت کی سنگینی دوسری تمام توجہات پر فوقیت رکھتی ہے۔

گذشتہ تین ماہ سے پاکستان ایک ایسے بحران میں محصور ہے کہ اس کی مثال اس کی تاریخ میں نایاب ہے۔ دس سال سے زیادہ عرصے تک اپنے حقوق سے محروم رہنے کے بعد عوام صدر ایوب خان کی حکومت کے خلاف بے خوف وخطر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس عظیم الشان ابھار کو تحریک کا نام دینا صحیح نہ ہوگا کیونکہ پاکستان میں جو کچھ زیر عمل ہے وہ تحریک نہیں انقلاب ہے۔ عوام کے دکھ ناقابل برداشت ہو چکے ہیں اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ہے۔ اب حالات کی باگ کو پیچھے کی جانب نہیں موڑا جا سکتا۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ عوام موجودہ نظام کو بدلنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں نہ کہ چند مراعات کے حصول کے لیے۔ ان کے ناقابل انتقال حقوق پر کوئی سمجھوتے بازی نہیں ہو سکتی۔ عوام نے اپنے مسروقہ حقوق کی بحالی کے لیے خون بہایا ہے کیونکہ انہیں یہ حقوق عزیز تھے وہ ان حقوق کے عوض حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتا

نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی خیرات یا عنایت کا معاملہ نہیں۔ مراعات ایک ایسا شرمناک لفظ ہے جو محلاتی سازشوں سے مخصوص ہے اور اس سے سمجھوتے بازی کی بُو آتی ہے اور سمجھوتے بازی کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ہتھیار رکھ دیئے جائیں اور مشروط اطاعت قبول کر لی جائے۔

عوام ایک خوفناک اضطراب سے گزر رہے ہیں۔ نوجوانوں نے جانیں قربان کی ہیں اور جیل خانے سرگرم عمل عوام اور ان کے رہنماؤں سے اٹے ہوئے ہیں۔ سرزمینِ وطن پر خوف و ہراس کے پہرے ہیں۔ عوام نے جس کثرت سے قربانیاں دی ہیں وہ اس بات کی مہلت نہیں دیتیں کہ اپنے حقوق کے بارے میں وہ دوبارہ دھوکا کھائیں۔ پاکستان کے عوام تبدیلی چاہتے ہیں نہ کہ مذاکراتی سمجھوتے بازی کے پردے میں حکومت کی برقراری۔ عوام نے حکومت کو رد کر دیا ہے۔ وہ بدعنوانی کینہ پروری اور دھوکا دہی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ نوکر شاہی کے تجاوزات، پولیس کے استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے اس مریضانہ نظام کی اونچ نیچ کو مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں جو عوام کے دکھوں پر پلتا رہا ہے۔

مستقبل کے دامن میں خیر کی اُمید بھی ہے اور بدی کا گمان بھی۔ اس وقت میزان کے پلڑوں میں قوم کا مقدر تُل رہا ہے اور تمام دوسرے اُمور پس منظر میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ بحران مرکزی اہمیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ لاینفک اتحاد کو اوّلین حیثیت حاصل ہے کوئی غلط فیصلہ، کوئی متزلزل عزم، صوابدید کی کوئی لغزش، دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی کوئی ترغیب تباہی کی جانب لے جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس دھمکیوں کے مقابل جراُت، عوام کی جدوجہد کو معراج تک پہنچانے کا عزم صمیم اور جبر کے خلاف بے خوف و خطر یلغار پاکستان کو اس پُرمسرت دَور سے ہم کنار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جس کا اقبال نے خواب دیکھا اور قائداعظم نے یقین دلایا تھا۔

اگلا قدم عہد آفرین ہے ۔ واضح مقصد کے بغیر یہ قدم صحیح رُخ میں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جب قائدین کو جیل کی دیواروں کے ذریعے ایک دوسرے سے جُدا کر دیا جائے، جب رسہ کشی کے ہاتھوں ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے، جب خلجان کا دَور دَورہ ہو تو حقیقتِ حال کے لیے کھُل کر سامنے آنے کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی۔ وہ ان ہنگامی قوانین سے عیاں نہیں ہو سکتی جو قوم کے سر پر ایک ہولناک بادل کی سیاہ چادر کی طرح تنے ہوئے ہیں کہ یہ وہ قوانین ہیں جنہوں نے غلامی کی زنجیروں سے عوام کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں۔ یہ استبدادی ذرائع حکمرانوں کے ہاتھوں کی ظالمانہ طاقت کی مہیب یاددہانی کراتے ہیں۔ ایسے مصیبت ناک حالات میں کسی قومی حل کی جانب قدم بڑھانا ممکن ہی نہیں۔ جو سمجھوتا ایسے حالات سے جنم لے گا وہ ایک فریب ہوگا، عوام کی امنگوں سے بے دردانہ غداری ہوگا۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور رائے عامہ کے دیگر اہم عناصر، جن میں مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی بھی شامل ہے جمہوری مجلسِ عمل کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ حکومت کا سامنا کرنے کے لیے تمام کی تمام اپوزیشن متحد نہیں۔ حکومت مدافعت پر اتر آئی ہے اور عوام کے غیض و غضب نے اُسے کونے میں لگا دیا ہے اور وہ اپنی بحالی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ اُس نے اپوزیشن میں تفریق پیدا کرنے کی ایک خام کوشش کی ہے۔

حکومت کے نزدیک فوری اہمیت اس مقصد کو حاصل ہے کہ عوامی تحریک کا زور توڑ دیا جائے۔ حکومت کسی ایسے ہتھکنڈے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے جس سے لوگوں کے جذب و شوق کو کُند کیا جا سکے، ان کے جوش و خروش کو سرد کیا جا سکے اور اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ تحریک کو تباہ کر دیا جائے۔

جوان سال جانوں کی قربانی کے باوجود، ان کی ولولہ انگیز جدوجہد کے باوجود، طالبعلموں

کے مطالبات پورے نہیں کیے گئے۔ اس کے برعکس انہیں ابھی تک زدوکوب کیا بلکہ پولیس کی جیپوں کے نیچے کچلا جا رہا ہے۔ بخیلانہ مراعات ان کا منہ چڑھانے کے مترادف ہیں طالب علموں کے مطالبات کو صدقِ دلی سے پورا کرنا وقت کا شدید تقاضا ہے۔ جو نوجوان شہید ہوئے ہیں ان کے کنبوں کو خون بہا ادا کرنا لازمی ہے۔ زخمی طلباء کو بھی مناسب ہرجانہ ملنا چاہیئے۔ یہ بات زخمی صحافیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ان لوگوں نے آزادی اور انسانی وقار کے لیے جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ وہ قوم کے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ طلباء کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی حکام کے غیر ضروری متشددانہ اقدامات کے دوران جانیں دی ہیں اور بہت سے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ مرحوموں کے کنبوں کو خون بہا اور زخمیوں کو ہرجانہ ملنا چاہیئے۔ صورتِ احوال ایسی وحشت ناک ہو گئی ہے کہ کلمے کی بے ادبی کی گئی ہے اور ابھی تک اس کے مرتکب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ علماء کو زدوکوب کیا گیا ہے اور ان پر لاٹھیاں برسائی گئی ہیں۔ پولیس نے ہماری مسجدوں کو بے حرمت کیا ہے۔ یہ دلدوز حالات کسی مثبت اقدام کے متقاضی ہیں۔ بے شمار لوگ ہوائی الزامات کی بناپر، یا الزامات کے بغیر ہی، جیلوں میں پڑے ہیں۔ انہیں فوری طور پر رہا کر دینا لازم ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن، خان عبدالولی خان اور سردار اکبر بگٹی جیسے قومی رہنماؤں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں بلاتاخیر رہا کر دینا لازم ہے۔ یہ وہ چند وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں نے زیرِ نظر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جب سے اس عدالتِ عالیہ میں میری رٹ پٹیشن دائر ہوئی ہے صورتِ حال میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور پچھلے چند دنوں میں یہ تبدیلی اور بھی گہری معنویت اختیار کر گئی ہے۔ پاکستانی عوام کی طرف سے مجھ پر جو فرض عاید ہوتا ہے میں اس سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ مجھ پر لازم آتا ہے کہ سر پر منڈلاتی ہوئی تباہی کو روکنے کے

لیے جو کچھ میرے بس میں ہو کر گزروں۔ اپوزیشن کو انتشار کا شکار نہیں ہونا، ڈراوے میں نہیں آنا، جھانسے میں آ کر طبقات میں نہیں بٹنا۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے سایے میں اُسے کانفرنس ٹیبل پر لے جایا جائے۔ خواہ کچھ ہو جائے عوام کے حقوق کی فوقیت لازم ہے اور ان کی جدوجہد کو فتح مبین کی معراج نصیب ہونی چاہیئے۔ اس آدرش کے لیے میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں، میں ان لوگوں کی صف میں شامل ہونے کو تیار ہوں جنہوں نے عوام کے حقوق کے لیے خون دیا ہے۔

پاکستان کی قیادت کو آنے والے دَور کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نام پر میں پاکستان کے عوام کے ساتھ یہ مقدس عہد کرتا ہوں کہ میری پارٹی اپنے محبوب وطن کے عظیم اور شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے لگاتار جدوجہد کرتی رہے گی۔ تاریخ کے ساتھ میرا یہی پیمان ہے۔

اس سلسلے میں حتمی طور پر کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ آج ہمیں جو عظیم مسئلہ درپیش ہے وہ کیونکر حل ہوگا۔ اس مسئلے کو اس وقت تک تو ہاتھ میں بھی نہیں لیا جا سکتا جب تک وہ ڈیفنس آف پاکستان رولز، جنہوں نے اس مسئلے کو بادلوں کی طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے، ختم نہیں کر دیے جاتے۔ آئندہ جو بھی ہو اس سے قبل یہ بنیادی شرط پوری ہونی چاہیئے کہ ہنگامی حالات ختم کر دیے جائیں۔ جب تک یہ بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی دوسرے تمام معاملات ساکت رہیں گے اور آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جب تک ہنگامی حالات ختم نہیں کیے جاتے کسی دوسرے معاملے پر توجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موجودہ صورتِ حال کے سیاق و سباق میں، موجودہ شکل میں جمہوریت کی اس جدوجہد میں حصہ لیتے ہوئے، اس جابرانہ قانون کے خلاف احتجاج کے طور پر جو عوام اور اُن کی آزادی کے درمیان دیوار بنا کھڑا ہے، میں، نتیجۃً، اپنی رٹ پٹیشن واپس لیتا

ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ اگر آج سے ایک ہفتے کے اندر اندر ہنگامی حالات ختم نہ کیے گئے تو میں تامرگ بھوک ہڑتال کردوں گا۔ حکومت کو ایک ہفتے کی مہلت دے کر میں اسے یہ معقول موقع فراہم کررہا ہوں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ ہنگامی حالات کا خاتمہ قومی مفاد کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ کوئی ذاتی مطالبہ نہیں۔ یہ مطالبہ نیک نیتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے بہترین مقصد ہے اور اس کی نوعیت الٹی میٹم کی نہیں ہے اس کے برعکس میرا فیصلہ پاکستان کے عوام کے اس مطالبے کا غماز ہے جو ان کے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔

میں آخر میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے نوجوانوں کو سلام کرتا ہوں جو اس عظیم تحریک کے اصل ہیرو ہیں۔ پاکستان زندہ باد"

مسٹر بھٹو کا بیان ختم ہونے کے بعد درخواست گذار بیگم نصرت بھٹو اٹھیں اور عدالت کو بتایا کہ وہ رٹ درخواست واپس لینا چاہتی ہیں۔

فاضل ججوں نے اس ضمن میں اپنے حکم میں لکھا — مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ہمارے روبرو بیان کیا ہے کہ جب اُن کی بیوی نے اُن کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست دائر کی تھی اُس وقت سے لے کر اب تک حالات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اُن کے لیے اپنی درخواست واپس لینا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے عدالت سے اس امر کی اجازت مانگی ہے۔ بیگم نصرت بھٹو نے اس کی تائید کی ہے۔

چونکہ یہ پٹیشن آئین کی دفعہ ۱۹۸ کے تحت دائر کی گئی ہے۔ اس لیے ہم اس پر پوری طرح غور کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں پھر کو حکم جاری کریں گے۔

طیّارے میں بم

۱۰ فروری کو جب رٹ درخواست کی سماعت شروع ہوئی تو مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین نے اٹارنی جنرل سیّد شریف الدین پیرزادہ سے کہا کہ وہ متعلقہ حلقوں سے اس بارے میں معلومات حاصل کریں کہ اگر ہنگامی حالت ختم کی جارہی ہے تو اُسے کب ختم کیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ آیا اس وقت اُن کے پاس اس سلسلے میں کوئی اطلاع موجود ہے۔

اس استفسار کے جواب میں اٹارنی جنرل نے مرکزی وزیرِ قانون کا ایک تار پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا "حکومت ہنگامی حالت ختم کرنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔ لیکن اس کے خاتمے کی قطعی تاریخ بتانا ممکن نہیں۔ ڈیفنس رولز کے تحت جو کارروائیاں کی گئی ہیں وہ قدرتی طور پر ہنگامی حالت ختم ہونے تک جاری رہیں گی۔ تاہم جیسا کہ وزیرِ قانون وضاحت کر چکے ہیں۔ کوئی نئی کارروائی نہیں کی جائے گی"۔

وزیرِ قانون کا تار اٹارنی جنرل کے اس استفساری تار کے جواب تھا۔ جو گذشتہ روز عدالت کی ہدایت کے مطابق ڈھاکہ میں مقیم مرکزی حکام کو بھیجا گیا تھا۔

فاضل جج نے تار کے مضمون پر حیرت کا اظہار کیا اور یہ رائے دی کہ صدر ایوب نے ہنگامی حالت ختم کرنے کے بارے میں جو بیان دیا تھا اور آج کے اخبارات میں جو

اطلاعات شائع ہوئی ہیں، وزیرِ قانون کا تار اُن سے ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتا۔ تازہ اطلاعات کے مطابق تو متعدد نظر بند جو ڈیفنس رولز کے تحت گرفتار کیے گئے تھے۔ رہا کیے جا چکے ہیں اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان ایک دو روز میں متوقع ہے۔ اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو پھر شاید عدالت کو اس معاملے پر مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس مرحلے پر فاضل جج نے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے نمائندے سے جو عدالت میں موجود تھا، استفسار کیا کہ ایمرجنسی ختم کرنے کے بارے میں اُن کی ایجنسی نے جو اطلاعات شائع کی ہیں۔ آیا وہ کوئی سرکاری بیان ہے یا یہ اطلاع کسی اور ذریعے سے آئی ہے۔ نمائندے نے بتایا کہ یہ اطلاع سرکاری ترجمان نے فراہم کی ہے جو بالعموم وزارتِ اطلاعات و نشریات کا سیکرٹری ہوتا ہے۔

فاضل جج نے اٹارنی جنرل سے کہا کہ وہ جیل کے ٹیلی فون پر متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کریں اور عدالت کو بتائیں کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ اس پر اٹارنی جنرل اور ہوم سیکرٹری کمرۂ عدالت سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اٹارنی جنرل نے واپس آکر عدالت کو بتایا کہ گورنر سے بات کی گئی ہے۔ انہوں نے اخباری اطلاعات پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ انہیں سرکاری طور پر ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہنگامی حالت ایک دو روز میں ختم کی جا رہی ہے تاہم انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ڈھاکہ میں متعلقہ حکام سے بات کر کے اصل صورتِ حال معلوم کریں گے اور عدالت کو اطلاع دیں گے۔ عدالت کے استفسار پر اٹارنی جنرل نے بتایا کہ انہیں مرکزی وزیرِ قانون کا تار کل شام سات بجے کے لگ بھگ موصول ہوا تھا۔ اے پی پی کے نمائندے نے فاضل جج کے استفسار پر بتایا کہ سرکاری ترجمان نے رات نو بجے یہ بیان دیا تھا۔

مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین نے کیس کی سماعت کے سلسلے میں بعض نکات کی وضاحت طلب کرنے کے بعد یہ حکم دیا کہ اب چونکہ عدالت میں نظر بند کا موجود رہنا

ضروری نہیں اور موجودہ حالات میں انہیں جیل میں رکھنا بھی نامناسب ہے اس لیے انہیں تاحکم ثانی لاڑکانہ میں اُن کے گھر میں نظر بند رکھا جائے۔ انہوں نے ہوم سیکرٹری کو ہدایت کی کہ وہ اس سلسلے میں ضروری انتظامات کریں۔ فاضل جج نے رائے ظاہر کی کہ گھر میں نظر بند کرنا عدیم المثال نہیں، آزادی سے پہلے سر آغا خان اور مسٹر گاندھی اپنے اپنے گھروں میں نظر بند کیے جاتے رہے ہیں۔

عدالت نے اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل اور وکیل میاں محمود علی قصوری سے کہا کہ وہ اگلی صبح بورسٹل جیل کی بجائے ہائی کورٹ میں اس سوال پر دلائل پیش کریں کہ اگر حبس بیجا کی درخواست پر کوئی شخص عدالت کی تحویل میں آجائے تو کیا عدالت نظر بندی کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کیے بغیر اُسے دوبارہ حکومت کی تحویل میں دے سکتی ہے۔

مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین کا خیال تھا کہ حبس بے جا کی درخواست واپس لینا اتنا آسان نہیں جتنا اس کیس میں سمجھا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جو ایک بار عدالت کے علم میں آجائیں تو پھر عدالت کو قانونی فیصلہ دینے سے نہیں روکا جا سکتا جس طرح گارڈین شپ کے مقدمات میں ہوتا ہے۔ فاضل جج نے مزید کہا کہ اب جبکہ مسٹر بھٹو کی نظر بندی سے متعلق ضروری مواد عدالت کی فائل پر ہے اور عدالت نظر بندی کی قانونی صحت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنانے کی پوزیشن میں ہے حبس بے جا کی درخواست واپس لینے کی درخواست منظور کرنا، عدالت کو اپنے اختیارات کے استعمال کے ناگزیر موقع سے روکنے کے مترادف ہوگا۔

قبل ازیں مسٹر محمود علی قصوری نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا وہ درخواست واپس لینے کی استدعا کے قانونی پہلوؤں پر میں نے بھی غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ جمعہ کے روز جب عدالت نے مجھے اس معاملے پر بیان دینے کے لیے کہا تھا تو میں نے اس لیے احتراز کیا تھا کہ مجھے شک تھا کہ حبس بے جا کی

درخواست واپس لی جاسکتی ہے۔ آئین اور قانون کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا شک مزید پختہ ہو گیا ہے۔ آئین کی شق ۹۸ ۔جس کے تحت یہ درخواست دائر کی گئی ہے، کسی بھی شخص کو حبس بیجا کی درخواست پیش کرنے کا اختیار دیتی ہے لیکن جب عدالت مجاز ایسی درخواست پر نوٹس جاری کر دے تو درخواست دہندہ عدالت کو اپنے فیصلے پر پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔ کیونکہ آئین عدالت پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ جب حراست کا کوئی واقعہ اُس کے علم میں لایا جائے تو وہ حراست کے جائز ہونے کے بارے میں اپنے آپ کو مطمئن کرے۔

عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل سے کہا کہ وہ اس بارے میں اپنا موقف پیش کریں کہ آیا حبس بے جا کی کوئی ایسی درخواست جس پر عدالت نے نوٹس جاری کرکے نظربند کو اپنی تحویل میں لے لیا ہو، واپس لی جاسکتی ہے اور یوں عدالت کو اس فرض کی انجام دہی سے روکا جاسکتا ہے جو آئین کی شق نمبر ۹۸ کے تحت اُس پر عاید ہوتا ہے۔ اور جس کے تحت اُسے یہ اطمینان کرنا پڑتا ہے کہ کسی شخص کو قانونی اختیار اور قانونی طریقے سے نظر بند رکھا جارہا ہے یا نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے اس قانونی نکتہ پر دلائل پیش کرنے کے لیے وقت مانگا۔

مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ڈیفنس رولز پر عملدر آمد ختم ہونے سے متعلق سرکاری اعلان سے بھی اس کیس پر اثر پڑتا ہے۔ اگر آج ہم مسٹر بھٹو کو رہا کردیں اور وہ جیل سے باہر جاتے ہی ایک ایسی تقریر کریں جو اُن کی پہلی تقریروں کے مقابلے میں بھی، جو نظر بندی کا سبب بنی ہیں، زیادہ سخت ہو تو ڈیفنس رولز کے قاعدہ نمبر ۳۲ کے تحت اُن کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خاص صورتِ حال جس میں رول نمبر ۳۲ کا استعمال ضروری سمجھا گیا تھا اب باقی نہ رہی۔ اور جب معاملے کی نوعیت یہ ہو تو پھر نظر بند کے

خلاف اس کارروائی کے تسلسل کا جواز کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ یہ سوال اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی اہم ہے کہ اس مقدمے سے متعلق سارا مواد عدالت میں پیش کیا جا چکا ہے، ہم اس مواد کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کی نظر بندی جائز ہے یا نہیں۔ اگر ہماری رائے یہ ہو کہ نظر بندی ناجائز ہے لیکن بیگم نصرت بھٹو ہمارے فیصلے سے پہلے ہی درخواست واپس لے لیں اور حکومت مسٹر بھٹو کو بدستور جیل میں رکھے تو ظاہر ہے کہ اُن کی نظربندی غیر قانونی ہو گی اور ہم بھی اس غیر قانونی نظر بندی کے ذمہ دار ہوں گے۔

مسٹر محمود علی قصوری نے عدالت سے استدعا کی کہ اگر وہ کیس واپس لینے کی درخواست منظور نہ کرے تو نظر بند کو مزید سترہ گواہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر اے بی اعوان، مسٹر انور آفریدی اور مسٹر رضوی نے جو بیانات دیے ہیں ان کی تردید میں ان گواہوں کو پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

گواہوں کی فہرست یہ تھی:- لیفٹننٹ جنرل محمد یوسف، مسٹر اقبال شعبان، مسٹر نذیر احمد چیئرمین فیڈرل پبلک سروس کمیشن، شیخ صفدر علی ایڈووکیٹ، ملک غلام جیلانی، میر علی احمد تالپور، میر علی بخش تالپور، مسٹر ایس ایم یوسف سیکرٹری دفتر خارجہ، مسٹر الطاف گوہر سیکرٹری اطلاعات، مسٹر تجمل حسین صوبائی سیکرٹری مالیات، مسٹر کے ایم قیصر سابق ڈائریکٹر جنرل دفتر خارجہ، مسٹر کمال الدین ڈائریکٹر جنرل دفتر خارجہ، گروپ کیپٹن جعفری پی اے ایف پشاور، مسٹر مصطفےٰ جتوئی ایم این اے، مسٹر نثار محمد ایم پی اے، مسٹر حامد رضا گیلانی ایم این اے اور مسٹر ممتاز بھٹو ایم این اے۔

نئے گواہوں کو طلب کرنے سے متعلق درخواست کے بارے میں عدالت نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اب جبکہ درخواست دہندہ نے دفعہ ۹۸ کے تحت دی گئی رٹ درخواست واپس لینے کی درخواست کی ہے اس لیے معمول کے مطابق گواہ طلب کرنے کی درخواست کی حیثیت ختم ہو جائے گی لیکن چونکہ ابھی رٹ درخواست واپس لینے کا مسئلہ فیصلہ طلب

ہے اس لیے عدالت گواہ طلب کرنے کی درخواست کو ریکارڈ میں شامل رکھے گی اور اہم نکات پر دلائل سننے کے بعد اس بارے میں فیصلہ دے گی۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ اگر رٹ درخواست کی سماعت جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا اور گواہوں کو بلایا گیا تو مسٹر بھٹو کو لاڑکانہ سے طلب کر لیا جائے گا۔

بھٹو صاحب نے عدالت میں ایک مختصر بیان میں کہا "مرکزی وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر اعوان نے اگلے روز میرے کیس میں جو بیان دیا ہے اس میں جان بوجھ کر بعض حقائق چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر عدالت نے میری اہلیہ کو رٹ درخواست واپس لینے کی اجازت نہ دی اور کیس کی مزید سماعت کا فیصلہ کیا تو میں اس گفتگو کا ٹیپ ریکارڈ پیش کروں گا جو پاکستانی سفیر لیفٹننٹ جنرل محمد یوسف نے کابل سے ٹرنک کال پر راولپنڈی میں مسٹر اعوان سے کی تھی۔ مسٹر بھٹو نے کہا" کابل میں جنرل یوسف نے مجھ سے جو بات چیت کی اس کے پیش نظر میں محتاط ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جنرل یوسف مجھ سے گفتگو کی رپورٹ مسٹر اعوان کو پہنچائیں گے چنانچہ میں نے اس متوقع کال کا ریکارڈ حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔ جسے میں عدالت میں پیش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اور اس ٹیپ سے اندازہ ہو سکے گا کہ مسٹر اعوان نے کن حقائق کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اس مرحلے پر عدالت کا اجلاس اگلے روز تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔

لاڑکانہ منتقل کرنے کا حکم

۱۱ فروری کے بعض اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بھٹو صاحب عدالت کے حکم کے مطابق لاڑکانہ پہنچا دیے گئے ہیں۔ ان اخبارات نے اُن کے لاڑکانہ پہنچنے کی تفصیلات بھی شائع کیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ابھی تک پُراسرار وجوہ کی بنا پر بورسٹل جیل لاہور میں موجود تھے۔ انہیں گیارہ فروری کو صبح کے نو بجے کوٹ لکھپت سے خیبر میل میں سوار کرایا گیا۔ مسٹر غلام مصطفےٰ کھر ایم این اے اُن کے ساتھ تھے۔ اس طرح تقریباً ایک سو دن مختلف جیلوں میں گزارنے کے بعد مسٹر بھٹو اپنے گھر واپس روانہ ہو گئے۔

اسی روز عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر، مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر حفیظ پیرزادہ اور اٹارنی جنرل سید شریف الدین پیرزادہ سے رٹ پٹیشن واپس لینے کی درخواست کے قانونی پہلوؤں کے بارے میں دلائل کی سماعت کی۔ تینوں وکیل اس بات پر متفق تھے کہ اگر نظر بند کے رشتے دار کے علاوہ جو نظر بندی کے حکم کو چیلنج کرتا ہے، خود نظر بند بھی رٹ درخواست واپس لینے کی خواہش ظاہر کرے تو پھر عدالت کی یہ ذمہ داری نہیں رہتی کہ وہ نظر بندی بے جواز کے بارے میں اطمینان کرے۔

ایڈووکیٹ جنرل نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظر بندی کو چیلنج کرنے

کے لیے عدالت کے سامنے درخواست پیش کرنی ضروری ہے۔ اب جب کہ رٹ درخواست واپس لینے کے بارے میں عدالت کے سامنے درخواست پیش کردی گئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جبس بیجا کے خلاف عدالت کے سامنے کوئی درخواست موجود نہیں۔

عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل سے استفسار کیا کہ آئین کے آرٹیکل ۹۸ کے تحت درخواست دائر ہونے کے بعد آیا کوئی شخص اس سے پہلے بھی اُسے واپس لے سکتا ہے جب تک کہ عدالت آرٹیکل ۹۸ کے تحت اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے یہ نہ دیکھ لے کہ کسی شخص کو قانونی اختیار کے تحت نظر بند کیا گیا ہے یا نہیں۔

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ ایک شخص جس نے درخواست دائر کی ہو۔ کسی وقت بھی اُسے واپس لے سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عدالت کے سامنے جبس بیجا کے خلاف کوئی درخواست کبھی موجود ہی نہیں تھی۔

درخواست دہندہ کے وکیل مسٹر حفیظ پیرزادہ نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ درخواست لینے کا حق صرف اُسی شخص کو حاصل ہے جس کی آزادی ختم کی گئی ہو۔ انہوں نے مزید کہا کہ آرٹیکل ۹۸ کے تحت دائر کی گئی پٹیشن میں عدالت کو یہ اطمینان کرنا ہوگا کہ آیا درخواست گزار کے علاوہ نظر بند بھی درخواست واپس لینا چاہتا ہے۔

عدالت کے استفسار پر مسٹر حفیظ پیرزادہ نے کہا کہ ایک شخص اپنے ایسے حق سے بھی دستبردار ہو سکتا ہے جو آئین کے تحت اُسے حاصل ہو۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب نظر بند اپنی پٹیشن واپس لیتا ہے تو درخواست کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ نظر بند کی رائے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل مسٹر شریف الدین پیرزادہ اپنے دلائل پیش کرنے

کے لیے کھڑے ہوئے۔

عدالت کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ وہ یہ دلائل اپنی طرف سے پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کیس میں انھوں نے کسی مرحلے پر بھی حکومت سے ہدایات نہیں لیں۔ مسٹر پیرزادہ نے مزید کہا کہ وہ آرٹیکل ۹۸ کے سلسلے میں آئینی پوزیشن کے متعلق اپنے دلائل پیش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کا موقف حکومت کے لیے پریشان کن ہو لیکن انھیں بنیادی طور پر اس عدالت عالی وقار میں اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔

اٹارنی جنرل نے کہا، جیسا کہ اس عدالت نے کل اپنے حکم میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ درخواست واپس لینا اتنا آسان نہیں جتنا اس کیس میں سمجھا گیا ہے، رٹ واپس لینے کی یہ درخواست عدیم المثال ہے۔

موجودہ آئین کے تحت عدالتیں شہریوں کے حقوق اور آزادی کی محافظ ہیں۔ آئین کی دفعہ ۹۸ کے تحت طریق کار آسان بنا دیا گیا ہے۔ عدالتِ عالیہ پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ نظر بندی کی وجوہ کے متعلق اپنا اطمینان کرے۔ اگر درخواست دہندہ اپنی پیٹیشن واپس لینا چاہتا ہے تو عدالتِ عالیہ کو پھر بھی اپنا فرض ادا کرنا ہوگا کہ وہ نظر بندی کے جواز سے متعلق اپنے آپ کو مطمئن کرے۔ تاہم عدالت اس بات کی منظوری دے سکتی ہے کہ نظر بند اپنی پیٹیشن واپس لے لے۔

مسٹر پیرزادہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس مقدمے میں محض پیٹیشن واپس لینے کی درخواست کافی نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے عدالت کی اجازت بھی ضروری ہے۔

انھوں نے درخواست دہندہ کے وکیل کی اس بات سے اتفاق کیا کہ جب پیٹیشن واپس لینے کے لیے نظر بند بھی درخواست گزار کی تائید کرے تو عدالت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔

دلائل کی سماعت کے بعد عدالت نے فیصلہ اگلے روز تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

شام کو پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی کمیٹی کے رکن ڈاکٹر مبشر حسن نے ایک بیان جاری کیا جس میں ۱۰ فروری کی رات کو مسٹر بھٹو کی طیارہ کے ذریعے لاڑکانہ روانگی ملتوی ہونے کی وجوہ بتائی گئی تھیں۔

بیان کا متن یہ ہے :-

"پاکستان کے عوام اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ حکومت، پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی جان کی حفاظت کا فرض ادا کرنے میں کس بڑی طرح ناکام رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے مسٹر بھٹو کو عوام کے محبوب لیڈر اور ایک شہری کی حیثیت سے تحفظ مہیا کرنے کے بجائے انتہائی غیر ذمہ دارانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ عوام کی چوکسی کی وجہ سے چیئرمین بھٹو عوامی جدّوجہد جاری رکھنے کے لیے سلامت ہیں۔

"جون ۱۹۶۷ء میں لاہور میں گول باغ کے جلسے میں اُن پر کرائے کے غنڈوں نے حملہ کیا اور انہیں زخم آئے۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں ملتان میں دو موقعوں پر اُن پر حملہ کیا گیا اور موٹر کاروں کے قافلے پر دن دہاڑے اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ ملتان سے خانیوال جا رہے تھے۔ اس کے بعد لاڑکانہ میں بعض ایسے افراد پکڑے گئے جن کے پاس ان کے گھر کا نقشہ اور دستی بم تھے۔ پشاور زیجن کے دورے کے دوران ڈیرہ اسماعیل خان میں پولیس نے آنسو گیس پھینکی جس سے ان کا قریب قریب دم گھٹ گیا۔

یُوں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے ابھی تک سبق نہیں سیکھا۔ ان حالات میں اگر ہیں پاکستان کے عوام کو دس اور گیارہ فروری ۱۹۶۹ء کی ہنگامہ خیز رات

سے آگاہ نہ کروں تو یہ فرض سے کوتاہی ہوگی۔ کیونکہ ۱۲ فروری کے اخبارات میں جو تفصیل شائع ہوئی ہے اُس سے پوری حقیقت سامنے نہیں آتی۔

حقائق یہ ہیں کہ جب حکومت ۱۰ فروری ۱۹۶۹ء کو دن کے وقت چیئرمین بھٹو کو گورنر کے طیارے میں لاہور سے لاڑکانہ لے جانے میں ناکام رہی تو پتا چلا کہ طیارہ تبدیل کر دیا گیا ہے اور انہیں ایک اور ایجنسی کے طیارے میں لاڑکانہ لے جایا جائے گا۔

رات گئے ہم ایک معتبر ذریعے سے یہ اطلاع پاکر دم بخود رہ گئے کہ چیئرمین بھٹو کے طیارے میں بم پھٹنے کا خطرہ ہے۔ ہمارا ذریعہ غیر مشتبہ تھا۔ فوراً ہم نے حکومت کے ذمہ دار حکام سے رابطہ قائم کیا۔ مگر یہ سُن کر ہم اور بھی خوف زدہ ہو گئے کہ حکومت بھی اس بات سے آگاہ ہے۔ چنانچہ رات گئے مسٹر بھٹو سے ملنے کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی اور حکومت کی یقین دہانیوں کے باوجود اُن کی بیگم اور دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ طیارے میں سفر نہ کریں۔ دوسری طرف حکومت کو اس کی انتہائی اہم ذمہ داری کا احساس دلایا گیا اور اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسٹر بھٹو کو طیارے کے ذریعے لاڑکانہ پہنچانے کا ارادہ ترک کر دے۔ یہ ہیں اصل حقائق۔ ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ چیئرمین بھٹو نے گیارہ فروری ۱۹۶۹ء کی صبح کو ٹرین میں کیوں سفر کیا اور حکومت کے منصوبے کے مطابق طیارے میں کیوں نہ گئے۔"

---

۱۲ فروری کو عدالت عالیہ کے خصوصی بنچ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور مسٹر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست واپس لینے کی اجازت دے دی۔ فیصلے میں عدالت نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ جوائنٹ سیکرٹری ہوم نے انہیں غلط اطلاع پہنچائی تھی۔

فیصلے کا متن یہ ہے :-

" سات فروری ۱۹۶۹ء کو نظر بند مسٹر بھٹو نے عدالت کو بتایا تھا کہ اُن کی اہلیہ کی طرف سے رٹ درخواست پیش ہونے کے بعد ملک کی سیاسی صورتِ حال میں تیز رفتار تبدیلیوں کے پیش نظر، اُن کی سمجھی سوچی رائے ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر ملک میں ہنگامی حالت ختم نہیں کی جاتی تو انہیں تامرگ بھوک ہڑتال شروع کر دینی چاہیئے۔ اس لیے انہیں پٹیشن واپس لینے کی اجازت دی جائے، درخواست دہندہ بیگم نصرت بھٹو نے اس استدعا میں اُن کی تائید کی تھی۔

(۲) ہم نے اس استدعا پر غور کرنے کے لیے یہ کیس ۱۰ فروری ۱۹۶۹ء پر ملتوی کر دیا اور پھر دلائل کی سماعت کے لیے ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء کی تاریخ مقرر کی۔

(۳) ہم نے اٹارنی جنرل پاکستان مسٹر شریف الدین پیرزادہ، ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان راجہ سید اکبر اور مسٹر حفیظ پیرزادہ ایڈووکیٹ کے دلائل سُنے ہیں۔ موخر الذکر نے درخواست دہندہ اور نظر بند دونوں کی نمائندگی کی۔

(۴) یہ سب اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ آئین کے آرٹیکل ۹۸ (۲) (بی) کے تحت کارروائی، درخواست کی پیروی میں کی جا سکتی ہے اور ازخود نہیں ہو سکتی۔ یہ کیس اس آرٹیکل کے تحت ایک درخواست پر شروع کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر درخواست دہندہ پٹیشن واپس لینے کی استدعا کرتا ہے اور اس درخواست میں نظر بند اُس کی تائید کرتا ہے تو عدالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ درخواست واپس لینے کی اجازت دے دے۔ عدالت اس معاملے پر مزید کارروائی اسی صورت میں کر سکتی ہے کہ اُسے ازخود کارروائی کرنے کا اختیار ہو۔ اور آرٹیکل ۹۸ (۲) بی عدالت کو اس قسم کا اختیار نہیں دیتا۔

(۵) فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے اس سلسلے میں محمد اسلم بنام سرکار (پی ایل ڈی ۱۹۵۹

ایس سی (پاک) ۱۱۹) پر انحصار کیا ہے جس میں ایک قیدی کے اپیل واپس لینے کے حق کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی۔

"اپیل تحریری قانون کی پیداوار ہوتی ہے۔ اور بنیادی طور پر حق سے متعلق ہوتی ہے۔ ایک سزا یافتہ شخص اپیل کرنے پر مجبور نہیں ہے جبکہ قانون اُسے اس قسم کا حق بھی دیتا ہو۔ اس کے مطابق ہم کوئی ایسا عام اصول تلاش کرنے کے ناقابل ہیں جو اپیل کو واپس لینے کی راہ میں حائل ہو، اگر کوئی شخص اپیل نہ کرنے کا انتخاب کرکے، سزا اور فیصلے کو قبول کر سکتا ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ محض اس حقیقت کو کہ اس نے اپیل دائر کی ہے بعد میں اس کے اس حق کو چھوڑنے میں رکاوٹ سمجھا جائے جبکہ اس کے برعکس کوئی اصول موجود نہیں۔

(۶) فاضل اٹارنی جنرل نے ہماری توجہ۔ کارپس جیورس سیکنڈم کی جلد ۳۹، صفحہ ۶۲۱ کے پیراگراف نمبر ۷۷، کی طرف دلائی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ:۔

"جب کوئی شخص، جس کی طرف سے اجرائے پروانہ کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے، عدالت یا جج کے سامنے لایا جائے تو اُسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کارروائی کو کنٹرول کرے اور اگر وہ کارروائی سے قطع تعلق کرے تو درخواست کو نظر انداز کر دیا جائیگا یا حکم کو کالعدم کر دیا جائے گا۔"

ان حالات میں، ہم درخواست دہندہ کو پٹیشن واپس لینے کی اجازت دیتے ہیں۔

(۷) اس کیس سے دستبردار ہونے سے پہلے ہم عوامی اہمیت کے ایک معاملے کا تذکرہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جو مقدمے کی سماعت کے دوران ضمناً پیدا ہوا تھا۔ نظر بند نے ایک حلفی بیان کے ذریعے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ انہیں میانوالی اور ساہیوال کی جیلوں میں نیم وحشیانہ حالات میں رکھا گیا ہے حالانکہ اُن سے "اے کلاس" نظر بند جیسا سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے مطابق ہم نے جوائنٹ سیکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ

کو طلب کیا جو کہ جیلوں کے انتظام کے انچارج ہیں اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ ہمیں انتہائی افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مزید تحقیقات پر، ہمیں پتا چلا کہ نہ صرف نظر بند کی طرف سے لگائے گئے الزامات درست تھے بلکہ جوائنٹ سیکرٹری نے ہمیں غلط اطلاع دی تھی جو انتظامیہ پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ جوائنٹ سیکرٹری کے پاس اس یقین دہانی کے سوا، کوئی وضاحت نہیں تھی کہ اس کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔

(۸) ہم اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر محمود علی قصوری کے شکرگزار ہیں کہ مقدمے کی ساری کارروائی کے دوران انہوں نے بطریقِ احسن ہماری امداد کی جس میں بکثرت پیچیدہ قانونی سوالات پیدا ہوئے۔ انہوں نے اُن پر زوردار لیکن جائز دلائل پیش کیے۔"

قاتلانہ حملے کی ناکام کوشش

مسٹر بھٹو ۱۲ فروری کو صبح چار بجے لاڑکانہ پہنچ گئے۔ راستے میں کئی سٹیشنوں پر ہزاروں لوگوں نے اُن کا استقبال کیا۔ جس شہر میں بھی لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب ریل گاڑی میں گزر رہے ہیں وہ ریلوے سٹیشن پر جمع ہو گئے۔

جب خیبر میل ملتان کینٹ سٹیشن پر پہنچی تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ گاڑی رکتے ہی فضا ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد اور آمریت مردہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مسٹر بھٹو نے کھڑکی کے شیشے کے پیچھے سے ہاتھ ہلا ہلا کر نعروں کا جواب دیا۔ پیپلز پارٹی کے دو مقامی رہنما صاحبزادہ فاروق علی خان اور مسٹر عمر کمال بھٹو صاحب کے ڈبے میں داخل ہو گئے اور تھوڑی دیر بات چیت کی۔ مسٹر بھٹو نے دروازے پر آنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ نظر بند تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ رہائی کے بعد وہ ضرور ملتان کا دورہ کریں گے۔

ایک مال گاڑی پٹڑی سے اتر جانے کے سبب مسٹر بھٹو کو لے جانے والی خیبر میل کو بہاول پور سے سولہ میل دور ایک گاؤں کلانچوالہ کے قریب رکنا پڑا۔ گاڑی ساڑھے تین گھنٹے وہاں کھڑی رہی۔ جب سادہ لوح دیہاتیوں کو معلوم ہوا کہ خیبر میل میں چیئرمین بھٹو موجود ہیں تو وہ یہ سوچ کر کہ شاید وہ بھوکے ہوں جلدی جلدی کھانا

تیار کر کے لائے۔ مسٹر بھٹو نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا، میں ایک "وفادار قیدی" ہوں اور بغیر اجازت آپ کا کھانا قبول نہیں کر سکتا۔ بہر حال جب دیہاتیوں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے چائے اور حلوہ قبول کر لیا۔

خیبر میل ۱۱ر فروری کو رات بارہ بج کر پانچ منٹ پر روہڑی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو سینکڑوں طلبا، وکلاء، پیپلز پارٹی کے کارکن اور شہری اپنے قائد کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بھٹو زندہ باد اور بھٹو ہمارا لیڈر ہے کے نعرے لگائے۔ بعض لوگ ڈبے میں داخل ہو گئے اور مسٹر بھٹو کے بوسے لیے اور اُن پر پھول برسائے۔

روہڑی سے مسٹر بھٹو کو بولان میل کے ذریعے لاڑکانہ روانہ کیا گیا۔ وہاں پہلے ہی شدت سے اُن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ حکام نے مسٹر بھٹو کی آمد کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن رات ہی سے سینکڑوں افراد سٹیشن پر جمع تھے۔ جب بھٹو صاحب اپنے ڈبے سے باہر نکلے تو نعروں اور پھولوں سے اُن کا استقبال کیا گیا۔ لاڑکانہ کے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ، پولیس کا ایک دستہ بھی ریلوے سٹیشن پر موجود تھا۔ سٹیشن سے باہر نکلنے پر جب بھٹو صاحب اپنی کار میں بیٹھنے لگے تو چند سپاہیوں کے علاوہ ایس پی نے بھی اُن کے ساتھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ بھٹو صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: "تم عوام کو تنگ کرتے ہو، میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم کار سے اُتر جاؤ۔" دس منٹ تک تکرار کے بعد بھٹو صاحب نے ایس پی کو کار سے نیچے اتار دیا اور چند کانسٹیبلوں کی معیت میں اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔

بنگلے کے چاروں طرف ہزاروں افراد جمع تھے تاکہ بھٹو صاحب کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ اسمبلیوں کے ارکان، طلباء، وکلا اور شہری جوق در جوق انہیں ملنے کیلئے

وہاں پہنچتے رہے۔ کیونکہ اُس وقت تک بنگلے پر پولیس کا پہرہ نہیں لگایا گیا تھا سکول کے بچوں نے بھٹو صاحب کی حمایت میں ایک جلوس نکالا۔ وہ پیپلز پارٹی کے پرچم لیے ہوئے تھے اور "جیئو بھٹو" "سدا جیئو بھٹو" کے نعرے لگا رہے تھے۔

۱۳ فروری کو پاکستان پیپلز پارٹی سندھ زون کے چیئرمین مسٹر عبدالوحید کٹپر ایڈووکیٹ نے اعلان کیا کہ اگر ہنگامی حالت ختم نہ ہوئی تو بھٹو صاحب کل نماز جمعہ کے بعد بھوک ہڑتال شروع کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں سینکڑوں افراد بھٹو صاحب کی حمایت میں بھوک ہڑتال شروع کر رہے ہیں۔

اس سے قبل ائیر مارشل اصغر خاں نے لاڑکانہ پہنچ کر بھٹو صاحب سے ملاقات کی اور کہا "قوم کو ابھی آپ سے بہت کام لینا ہے اس لیے آپ بھوک ہڑتال کر کے اپنی جان نہ دیں" بھٹو صاحب نے جواب دیا، "میری جان پاکستان کے بارہ کروڑ افراد سے زیادہ قیمتی نہیں۔ میں قومی مفاد کی خاطر باعزت موت مر جانا بہتر سمجھتا ہوں"

اسی روز پیپلز پارٹی سندھ زون کے چیئرمین مسٹر عبدالوحید ایڈووکیٹ کے مکان پر ایک اجتماع ہوا جس میں متعدد نوجوانوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں پیپلز گارڈز کا پہلا جتھہ تیار کیا گیا۔ پیپلز گارڈز کے اس جتھے میں چالیس ارکان شامل تھے۔ اجلاس میں شریک ہونے والے اہم نوجوانوں نے اپنے آپ کو رکنیت کا اہل ثابت کرنے کے لیے باری باری ایک جلتی ہوئی موم بتی پر دس سیکنڈ تک اپنی انگلی رکھی۔ ایک نوجوان نے ذرا ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ چنانچہ اُسے شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ باقی چالیس سرفروش بھرتی کر لیے گئے۔ انہوں نے قرآن پاک اٹھا کر عہد کیا کہ وہ بھٹو صاحب کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے اور جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے دلعدازاں

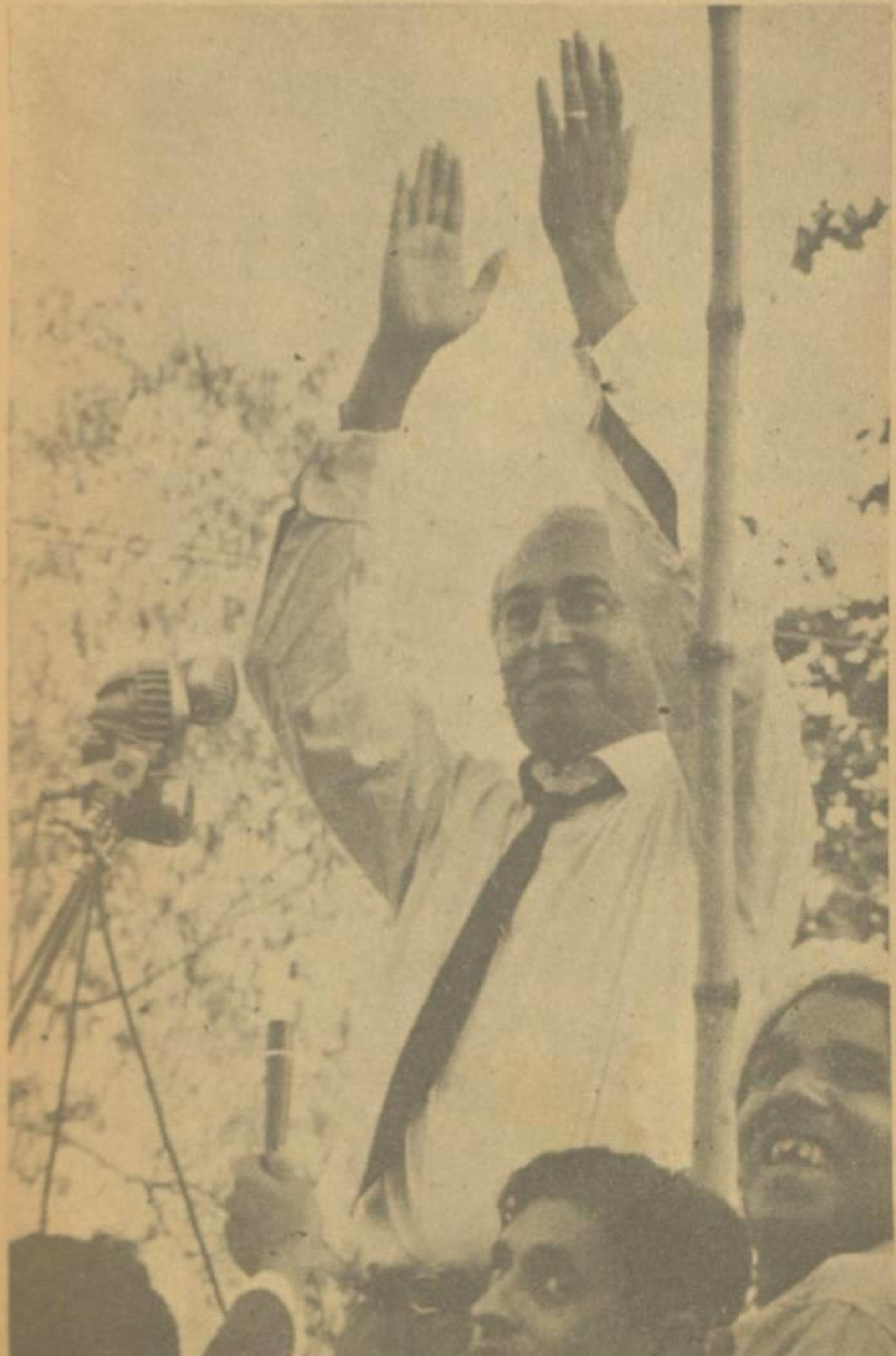
سرگودھا اور دوسرے شہروں میں بھی اسی طریقے سے پیپلز گارڈز کے جتھے ترتیب دیئے گئے)

۱۵ر فروری کو حکومت نے اعلان کیا کہ ہنگامی حالت اگلے روز ختم کی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ بہر حال بھٹو صاحب نے سابقہ اعلان کے مطابق بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ عملی طور پر ہنگامی حالت ختم ہونے تک بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے۔ مسٹر غلام مصطفٰی کھر ایم این اے، اور مسٹر نثار محمد خاں ایم پی اے چارسدہ نے اُن کے ساتھ بھوک ہڑتال کی البتہ بھٹو صاحب کی اپیل پر پارٹی کے دوسرے کارکنوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

جب لاڑکانہ میں لوگوں کو مسٹر بھٹو کی رہائی کا علم ہوا تو ہزاروں افراد اُن کے بنگلے کے سامنے جمع ہو گئے۔ انہیں جلوس کی شکل میں نیشنل سٹیڈیم لے جایا گیا۔ بھٹو صاحب ایک ٹرک پر کھڑے تھے۔ جلوس میونسپل کمیٹی کے قریب پہنچا تو لیاقت نامی ایک نوجوان نے پستول سے بھٹو صاحب پر گولی چلانے کی کوشش کی۔ مجمع نے فوراً اس نوجوان کو دبوچ لیا۔ لوگ اتنے مشتعل تھے کہ اُسے جان سے مارنا چاہتے تھے لیکن بھٹو صاحب کے کہنے پر اُس کی جان بخش دی گئی اور اُسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس نے اس کیس میں بھی اپنی سابقہ روایت برقرار رکھی اور معاملہ داخل دفتر کر دیا۔

نیشنل سٹیڈیم پہنچ کر بھٹو صاحب نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے عوام کو پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا، "میں جانتا ہوں کہ حملہ کس نے کرایا ہے لیکن مصلحتاً اس کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ اب تک مجھ پر متعدد بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں لیکن میری زندگی قوم کی امانت ہے، اور جب تک خداوند تعالیٰ میرے حافظ و ناصر ہیں میں زندہ رہوں گا۔"

خوشنویس: متین





آیا تو اک ادا سے عدالت میں آئے گا

